آزمائش کی گھڑی

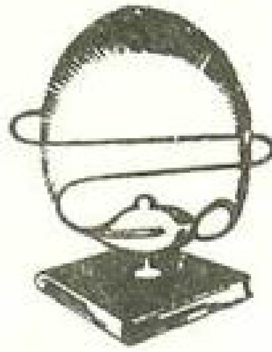
سیّد حامد



آزمائش کی گھڑی

سیّد حامد

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی



تقسیم کار

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ 202002

پہلی بار اپریل ۹۳ء　　تعداد 500　　قیمت =/54

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس۔ دریا گنج۔ نئی دہلی۲ میں طبع ہوئی۔

انتساب

بابری مسجد کے نام

جسے ظالموں نے توڑ ڈالا

ہندستانی مسلمانوں کے نام

جن کا حوصلہ سالم اور ثابت ہے

ان معصوموں کے نام

جنھوں نے اپنی جان مال عزت آبرو ایثار کردی

فہرست

زحمت

صفحہ	سطر	چھپا ہوا لفظ	صحیح لفظ
انتساب	ساتویں	ایثار	نثار
۵	آخری سے پہلی	بنتی	بنتیں
۶	دوسری	ثناور	شناور
۱۲	پہلی	آشایش	آسایش
۲۱	چوتھی	کے	نے
۲۳	نویں	نیرادھار	نرادھار
۲۵	آخری سے چھٹی	انوبایوں	انویایوں
۲۶	ساتویں	مایہ	پایہ
۲۶	آٹھویں	سیکوں	سیوکوں
۲۷	پانچویں	خوشحال	خوشحالی
۲۷	دسویں	جس	جن
۲۸	نیچے سے نویں	تباتے	بناتے
۲۹	دوسرا پیراگراف پہلی لائن	سمجھانا اور سمجھانا	سُجھانا اور سمجھانا
۳۰	بارہویں	جانی	جاتی
۳۴	دسویں	بغایتہ	لغایتہ
۳۴	آخری سے دسویں	جس	میں
۳۷	آخری سے تیسری	نہ بھولے کہ بھولئے	نہ بھولیئے
۴۲	پہلی	اغازی	غازی
۴۷	پہلی	مجرح	مجروح
۴۹	نویں	ہندوّیت (ہندتو)	ہندوتو
۴۹	گیارہویں	"کارڈر"	کاڈر
۴۹	آخری سے بارہویں	ایک عرصہ	ایک عرصہ سے
۴۹	آخری سے چھٹی	ذریے	ذریعے

صفحہ	سطر	چھپا ہوا لفظ	صحیح لفظ
۵۱	دسویں	کی جہاں	کی تعبیر جہاں
۵۱	بیسویں	قنولیت	قنوطیت
۵۵	پندرہویں	ہوں	ہو
۵۶	آخری سے چھٹی	جب	جو اب
۵۷	پانچویں	ریجھ جائے	بجھ جاتے
۵۸	نویں	امیدی	رسدی
۵۸	دسویں	تو	تو سرکار
۵۸	آخری سے ساتویں	کیجیے	نہ کیجیے
۵۹	آخری سے پانچویں	ہندویت	ہندوتو
۶۶	آخری سے دسویں	باخود	یا خود
۷۴	دوسرا پیرا، دوسری لائن	ہے	ہیں
۸۷	آخری سے تیسری	مطمئن	سے مطمئن
۸۹	دوسرا پیرا، دوسری لائن	بیں	بن
۹۷	پہلی	پھلمنساہت	بھلمنساہت
۱۰۶	آخری سے چوتھی	بیر	بے تعلقی
۱۰۹	آخری سے نویں	ہیمز	ہمیز
۱۱۶	آخری سے بارہویں	رکھتے	رکھے
۱۲۱	آٹھویں	شبہ	شبیہہ
۱۲۱	سولہویں	جگہ پر تعمیر	جگہ تعمیر
۱۲۴	آخری سے آٹھویں	حکومت وقتِ وقت	حکومتِ وقت
۱۲۶	آخری سے گیارہویں	بے حس	بے چین
۱۲۶	آخری سے چھٹی	بوچھ	بوجھ
۱۲۶	آخری سے چوتھی	حکومت کو	حکومت
۱۳۴	آخری سے ساتویں	جس	جن
۱۳۶	ساتویں	توڑ لیں	جوڑ لیں

تمہید

گزشتہ چھے سات سال ہندستان نے آگے بڑھنے کے، بجائے پیچھے کی طرف جانے میں صرف کیے ہیں۔ اس نے اِس اثنا میں رواداری کی اس دیرینہ روایت کو جس پر اسے سدا ناز رہا ہے تہ تیغ کر دیا، انسان دوستی کا سبق جو صدیوں تک اسے ازبر رہا تھا، اس نے یک قلم فراموش کر دیا۔ اس نے نفرت اور عداوت کی آگ کو ہوا دی اور بھلائی اور خیر اندیشی کو خیر باد کہہ دیا۔ آج سے پینتالیس سال پہلے جب ہندستان آزاد ہوا اس وقت بھی اس پر بے گناہوں کے خون بہانے کا دورہ پڑا تھا۔ وہ خوں بار داستان آئی گئی ہوئی۔ اس عرصہ میں کدورتیں ڈھل جانی چاہییں تھی، زخم بھر جانے چاہییں تھے۔ افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ بلوؤں کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ حکومت میں جہاں ڈھیل آئی، سیاسی خود غرضی نے جہاں زور پکڑا، سادہ دلوں کا استحصال جب اپنے عروج کو پہنچا، کمزوروں نے جب اپنا حق مانگایا ناانصافی کے خلاف احتجاج کیا، وہیں اکثریت نے جسے کثرتِ تعداد کا نشہ تھا، جو بڑی اقلیت کے درپے انتقام تھی، اسے فرقہ وارانہ فساد کی چکّی میں پیس دیا۔

عداوت اور خونریزی کو بڑھاوا سیاسی پارٹیوں نے دیا۔ انھوں نے ووٹ حاصل کرنے کے لیے مذہب اور ذات پات کا استعمال دیدہ دلیری نا عاقبت اندیشی اور وطن دشمنی کے ساتھ کیا۔ بڑی اقلیت یعنی مسلمان اپنے پرائے کے بہکائے میں آتے رہے۔ چونکہ ان کی اکثریت جاہل اور ان پڑھ تھی جو اپنے بھلے برے میں فرق نہیں کر سکتی تھی لہٰذا اس کو فریب دینا یا مشتعل کر دینا اس کی اور اغیار کی قیادت کے بائیں ہاتھ کا کھیل بن گیا۔ مسلمانوں کی قیادت نے عام طور پر خود غرضی کو اپنا شعار بنا لیا تھا۔ وہ اپنی ذاتی غرض کو ملّت کے مفاد کے اوپر رکھتی رہی۔ اسے صرف اپنی خوشحالی، ناموری، اثر اور اقتدار کی فکر تھی۔ اس نے ذرا دیر کو بھی یہ نہیں سوچا کہ قومیں جماعتیں، ملّتیں، محنت، صحت، تنظیم، اتحاد اور تعلیم سے بنا کرتی ہیں، جذباتی اشتعال سے نہیں بنتی۔ آستین چڑھانے، بڑھ چڑھ کر دعوا کرنے اور لن ترانیوں اور جہالت سے نہیں بنتیں۔ مسلمانوں کی قیادت نے

ان کی تعلیم اور تنظیم کی طرف سرے سے دھیان نہیں دیا۔ اس قیادت میں عصری سیاست کے شناور تھے اور دینی علوم کے منتہی بھی۔ دونوں کی قیادت ادھوری رہی۔ علمائے دین عام طور پر دنیا اور جدید علوم سے بے خبر تھے اور اہل سیاست کو اخلاقی اقدار سے سروکار نہ تھا۔ دینی تعلیم کا نظام کچھ ایسا ہے کہ زندگی اور باخبری کے نہ معلوم کتنے گوشے تشنہ رہ جاتے ہیں۔ اور اب تو عام طور پر دینی تعلیم کی طرف وہی بچے جاتے ہیں جن کا تعلق خوشحال گھرانوں سے نہیں ہے اور جن کی ذہنی صلاحیتوں کی ستائش اہل عقیدت کے لیے بھی دشوار ہوگی۔ یہ بات افسوس ناک ہے کہ صدیوں سے دینی تعلیم کے نصاب اور طریق تدریس میں کوئی قابلِ لحاظ تبدیلی نہیں ہوئی۔ مدارس کے طلبہ کی ایک بڑی تعداد دین کی روح سے ناآشنا رہتی ہے۔ وہ زندگی کی تفسیر دین کی روشنی میں کرنے سے قاصر ہے۔ علماء کو عوام کی تائید میسر ہے کہ وہ ان کے قریب ہیں اور ان کے دکھ درد میں ان کے شریک۔

اس کے برعکس وہ لوگ جو عصری دانش کے ترجمان سمجھے جاتے ہیں عوام سے عام طور پر دور رہتے ہیں، بہت دور۔ گویا دونوں کی دنیائیں الگ الگ ہیں۔ عوام ان سے عام طور پر بدگمان رہتے ہیں اور ان سے خود غرضی منسوب کرتے ہیں۔ غریب مسلمانوں کی بستیوں کے پاس یہ لوگ پھٹکتے ہی نہیں۔ ادھر سے کبھی گزرنا ہوا تو انداز ناک پر رومال رکھنے کا سا ہوتا ہے۔ یہ لوگ بہ کمال فراخ دلی دانشور کہلاتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عصر حاضر اور رفتار زمانہ کا علم اور ادراک انھیں دین کے عالموں سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن اس گروہ کی شہرت خویشتن پروری اور ملّی امور کے بارے میں بےحسی کی ہے۔

تصویر کے خدوخال آپ کے سامنے آگئے۔ ایک طرف زیادہ تر مسلمان جہالت میں گرفتار ہیں، دوسری طرف ان کے علماء عصر حاضر سے بےخبر اور کنارہ کش، ان کے اہل سیاست اخلاقی قدروں سے ناآشنا اور دور تک دیکھنے سے قاصر۔ اب آپ ہی بتلایئے ہندستانی مسلمانوں کو روشنی ملے تو کہاں سے ملے۔ ایسے ماحول میں خود غرضوں، طالع آزماؤں اور استحصال شعاروں کی بن آتی ہے اور ملت بگڑتی چلی جاتی ہے مسلمان عوام کو نہ ان کے علما نے بتایا نہ دانشوروں نے کہ آزادی اور بٹوارہ کے تحت بدلے ہوئے حالات میں انھیں اپنی طرزِ فکر، حتیٰ کہ اپنی افتادِ طبع تک میں ترمیم کرنی چاہیے۔ ہرچند کہ ان کی آبادی بارہ کروڑ ہے تاہم وہ ملک کی اکثریت کی ایک ادنا سی کسر ہیں۔ اکثریت کے ساتھ مل کر زندگی بسر کرنے کے گُر سیکھنے چاہییں۔ سر جھکا کر نہیں، سرافرازی کے ساتھ۔ جس طرح کہ ایک سیکولر جمہوریت کے شہری رہتے ہیں۔ اپنے دین اور ثقافت پر کاربند رہتے ہوئے اور اپنے مفاد کا تحفظ کرتے ہوئے انھیں لازم ہے کہ اپنے اہل وطن کے جذبات اور ان سے ان کی جائز توقعات کو احترام کے ساتھ ملحوظِ خاطر رکھیں۔ کوئی بات

ایسی نہ کریں جس سے انھیں جراحت پہنچے یا وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں کہ ملک کی ترقی میں مسلمانوں کو جو حصّہ لینا چاہیے تھا وہ نہیں لے رہے ہیں، دوسرے شہریوں کو تکلیف پہنچا رہے ہیں اور ملک کو پیچھے کی طرف لے جا رہے ہیں۔ مسلمانوں نے ابھی تک خود کو یہ نہیں سمجھایا کہ ان دو صورتوں میں بڑا فرق ہے۔ پہلی صورت ایسے ملک میں رہنا جو اسلامی ملک ہے اور جہاں کی آبادی بیشتر مسلمان ہے، دوسری صورت ایسے جمہوری ملک میں رہنا جہاں بہت سے فرقے آباد ہیں۔ دوسری صورت میں مسلمانوں پر عقل و اخلاق کی رُو سے واجب ہے کہ اپنے غیر مسلم ہم وطنوں کے جذبات اور احساسات کا خیال رکھیں اور اپنے اطوار و عادات کو اسی سانچے میں ڈھالیں مثلاً اگر پاکستان میں مسلمان لاوڈ اسپیکروں سے اذان دیتے ہیں اور رمضان شریف میں رات کو دن میں بدل دیتے ہیں اور بازاروں کو رات بھر روشن اور پُر صدا رکھتے ہیں تو یہ بجا ہے، لیکن اگر مسلمان ہندستان میں ملی جلی آبادی کے درمیان ایسا کریں تو یہ ناروا ہوگا۔ اس سے غیر مسلموں کی نیند اور سکون میں خلل پڑے گا۔ اسی طرح اگر وہ پاکستان میں عام شاہراہوں پر جمعہ کی نماز اس طرح پڑھتے ہیں کہ راستہ بند ہو جاتا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن اگر ہندستان میں وہ روش اختیار کریں تو یہ غیر مسلموں کی تکلیف اور ناگواری کا باعث ہوگا۔ ہمارا فرض ہے کہ ہمیں جو آزادیاں حاصل ہیں انھیں اس انداز سے برتیں کہ ان سے ہمارے ہمسایوں کو تکلیف نہ ہو۔ وہ حقوق کھوکھلے ہوتے ہیں جن کی پیٹھ پر فرائض نہ ہوں اور جن کی تہ میں دوسروں کے آرام و سکون کا خیال نہ ہو۔

اقلیت کے لیے ایک بات اور ضروری ہے بلکہ اقلیت کی صورتِ حال کی منطق ہی یہ ہے کہ اس کے افراد اکثریت کے افراد سے زیادہ محنت کریں اور کسبِ فضیلت میں اکثریت سے بازی لے جائیں۔ مسلمانوں نے ابھی یہ سبق نہیں پڑھا۔ زیادہ درکنار، وہ اکثریت کے برابر بھی محنت نہیں کرتے۔ وہ محروم رہتے ہیں، اس محرومی میں دوسروں کی ناانصافی کے ساتھ ان کی کم کوشی کو بھی دخل ہے۔ یہ بدقسمتی نہیں تو کیا ہے کہ ان کے تعلیمی اداروں میں ایسے سربراہوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا جاتا ہے جو ان کی اصلاح کے لیے کوشاں ہوتے ہیں اور جو نظم و ضبط کے ذریعہ تحصیلِ علم و تحقیق کا صحیح ماحول پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ سربراہ کے خلاف سازش اور شورش کو خارجی مدد اق کے سیاست دانوں اور اکابرین سے ملتی ہے۔

ہماری افتادِ طبع میں یہ وصف بھی لکھ دیا گیا ہے کہ ہم جلدی مشتعل ہو جاتے ہیں، جلد فیصلہ کر لیتے ہیں، یہ سوچے بغیر کہ بالآخر اس سے کیا نتائج نکلیں گے۔ دوسرے لوگ جو تیاری ہمارے خلاف کر رہے ہیں اس سے ہم آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ ہمیں اس وقت تک خطرہ کا احساس ہی نہیں ہوتا جب تک کہ خطرہ جست لگا کر ہمیں دبوچ نہیں لیتا۔ دور اندیشی اور منصوبہ سازی کو ہم وضعِ توکّل کے خلاف سمجھتے ہیں

اس لیے ہماری لڑائی بے تیاری کے ہوتی ہے اور اس وجہ سے ہم آسانی سے مات کھا جاتے ہیں لیکن ہیکڑی ہیں ہم دعوے ہمیشہ بڑھ چڑھ کر کرتے ہیں جنھیں سُن کر اغیار خطرہ محسوس کرنے لگتے ہیں اور اپنی تیاریوں کو تیز کر دیتے ہیں۔

اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا کہ اگر ہندستانی مسلمان غیر مسلموں کے جذبات اور احساسات کا خیال رکھیں تو زندگی ان کے لیے پھولوں کی سیج بن جائے گی۔ جہاں ہمیں جمہوریت کی صورتِ حالات اور شہریوں کے حقوق و فرائض کا احساس ہے، وہاں ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جس وسیع ملک میں ہم رہتے ہیں اس کی ایک تاریخ ہے۔ اس ملک میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو ساتھ رہتے ہوئے ایک زاویہ سے تقریباً بارہ سو سال اور دوسرے زاویہ سے آٹھ سو سال ہوئے ہیں۔ مسلمان یہاں فاتح کی حیثیت سے آئے۔ انھوں نے شروع میں یہاں کے ہندو راجاؤں سے جنگ کی، بعد میں جو مسلمان آئے ان کی لڑائی مسلمان بادشاہوں سے ہوئی۔ مسلمان فاتح ہندستان میں حکومت اور دولت کی تلاش میں آئے۔ ان کا مقصد اشاعتِ اسلام نہیں تھا۔ نہ انھوں نے اپنی ہندو رعایا کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا۔ ان کے عملہ اور دفاتر اور لشکر میں مسلمانوں کی طرح ہندو بھی تھے حملہ آوری کی رَو میں اور بغاوت اور سازش کا قلع قمع کرنے کے لیے انھوں نے بعض اوقات کچھ مندروں کو منہدم کیا لیکن اُنہی بادشاہوں نے مندر بنوائے بھی اور مندروں کو جاگیریں بھی دیں۔ پچاسوں بادشاہوں میں سے دو ایک نے غیر مسلموں کو فوجی امداد سے مستثنا کرتے ہوئے ان پر جزیہ لگایا۔ ان اقدامات کی جراحت ہندوؤں کے دلوں میں ابھی تک مُندمل نہیں ہوئی۔ یہ زخم انگریزوں نے آکر اپنی حکومت کو قایم رکھنے کے لیے کُرید دیے۔ انھوں نے تاریخ کو مسخ کیا اور تاریخ کی کتابوں میں یہ دکھایا کہ مسلمان بادشاہوں نے ہندوؤں پر ظلم کے پہاڑ توڑ دیے تھے۔ بعض ہندو مورخین ان پیش رووں کے نقشِ قدم پر چلے، کہیں رائی اور کہیں ٹیلے کا پہاڑ بنا دیا۔ ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے عداوت کا زہر بھر گیا۔ انھوں نے مسلمانوں کو ان کے کردہ اور ناکردہ گناہوں کے لیے معاف نہیں کیا۔ انتقام کی آگ بہت سے ہندوؤں کے دلوں میں بھڑکتی رہ گئی۔ حتیٰ کہ غریب اردو زبان، جو یہاں کی تہذیبوں کا سنگم ہے اور جو دلوں کو ملانے والی ہے، ہندو انتہا پسندوں کے غم و غصہ کا ہدف بن گئی۔ انگریز حکمرانوں کے دور میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف، رنجش اور عداوت کا ایک سبب ہندوؤں کی یہ تحریک تھی کہ شمالی صوبہ میں سرکاری زبان اردو کے بجائے ہندی بنا دی جائے۔ اگر وہ یہ کہتے کہ ہندی بھی بنا دی جائے تو کسے اعتراض ہوتا لیکن ہندی کی محبت سے زیادہ انھیں اردو سے عداوت تھی اور یہی عداوت در اصل ملک کے بٹوارے کے برگ و بار لائی۔ سرسید، جو ہندستان

اور اس کے باشندوں کے خیر خواہ اور ثنا خواں تھے، اسی واقعہ کے بعد سے ہندوؤں سے بدظن ہو گئے۔ عجیب اتفاق ہے کہ مسلمانوں کے بڑے بڑے لیڈروں نے ہمیشہ آغاز گہری قوم پرستی سے کیا اور اواخر ایام میں ان میں سے بیشتر اکثریت کی نیت اور عزائم سے بدگمان ہو کر علاحدگی کے آغوش میں بیٹھ گئے۔

ہندستان کی سیاست کے اہم عناصر کا تذکرہ بھی کر دیا جائے۔ فی الوقت انھیں تین گروہوں میں بانٹ سکتے ہیں: کانگریس، بی جے پی اور بائیں بازو کی پارٹیاں۔ مسز اندرا گاندھی کے اقتدار کے آخری دو سالوں میں مرکزی حکومت دو مرضوں میں مبتلا ہو گئی (۱) بے اصولی ڈھیل ڈھال اور اوباش نوازی (۲) مسلمانوں کے ساتھ بے مہری اور تعصب۔ درج فہرست ذاتوں کی طرح مسلمانوں کو کانگریس کا ووٹ بینک سمجھا جاتا تھا۔ اب کانگریس نے یہ غیر ملفوظ فیصلہ کیا کہ اگر وہ سیکولر انصاف کی بندشوں کو توڑ دے اور ہندوؤں کی طرف اپنا رجحان ظاہر کر دے تو وہ مسلمانوں کے ووٹوں کی ضرورت مند اور دست نگر نہ رہے گی۔ راجیو گاندھی آخری عمر تک پبلک اسکول کی قبا زیب تن کیے رہے۔ وہ ہوش وگوش اور شعور و فراست سے بالعموم بے نیاز تھے۔ ان کے قتل کے بعد بی جے پی بادشاہ گر بن گئی۔ اس کی امداد کے بغیر کوئی حکومت نہ بن سکتی تھی، نہ قائم رہ سکتی تھی۔ وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے سیاسی حاجت مندی کے تحت بھاجپا کو گلے لگایا، اس کے وزن و اعتبار میں اضافہ کیا۔ راجہ صاحب اپنی فکر و فضل کے باوصف اس قوتِ فیصلہ سے محروم تھے جو ملک کے سربراہ کے لیے ازحد ضروری ہے۔ ان کے پاس تخیل تھا اور خیال کو الفاظ میں سلیقہ سے ڈھالنے کا ہنر اور داؤ پیچ کا ملکہ، لیکن ان کی دانش کی سرحدیں چالاکی سے ملی ہوئی تھیں۔ اہل تردد سے راج کاج نہیں چلا کرتا۔

ہندستان کے موجودہ وزیر اعظم نرسمہا راؤ زباندانی اور شاید علم و فضل میں وی پی سنگھ صاحب سے بڑھ کر ہیں اور تردد میں کہیں آگے۔ ان کے پاس لیاقت کی ذیل میں سب کچھ ہے سوائے فیصلہ کی طاقت کے۔ حالانکہ اگر اور کچھ نہ ہوتا صرف فیصلہ کی صلاحیت ہوتی تو وہ پرائم منسٹری کے لیے موزوں ہوتے۔ انھیں داد جب ملی اس بات پر ملی کہ وہ سب کو ساتھ لے کر چل پاتے ہیں۔ جو شخص دوسروں کی رفتار کا خود کو پابند کر دے، وہ کارواں سالاری کے فرائض کیسے انجام دے گا؟ بہت سے لوگ تو ان کی نیت پر بھی شبہہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کی حیرت انگیز اور ہوش ربا تاخیر کے پردے میں مصلحتیں چھپی ہوتی ہیں۔ ایسا چاہے ہو یا نہ ہو، یہ بات اپنی جگہ پر ہے کہ شری راؤ سے زیادہ غیر موزوں کوئی شخص ہندستان جیسے وسیع اور پیچ در پیچ ملک کی سربراہی کے لیے نہیں ہو سکتا لیکن

ہماری سیاست کا خمیر کچھ ایسا اٹھا ہے کہ وہ پارٹی جو طاقت میں ہے انھیں ناموزونی اور ناکامیابی کے باوجود ملک کا سربراہ بنائے ہوئے ہے۔ یہ سب لوگ ہوس کے بندے ہیں، ذاتی اغراض کو محفوظ کر کے یہ ملک کی فلاح کی بات کرتے ہیں۔ لارڈ ویول نے (جنھیں ملک نے ان کی انصاف پسندی کی وجہ سے راندۂ درگاہ بنا دیا ہے) ٹھیک کہا تھا کہ ہندستان کو چلانا صرف مضبوط ہاتھوں کے ذریعہ ممکن ہے۔ سربراہ کی ڈھلمل یقینی ملک کی تباہی اور مظلوموں اور کمزوروں کی بربادی کا باعث ہوتی ہے۔

حالیہ ہندستان کے خدّوخال کی صورت گری کرتے ہوئے ایک اُچٹتا ہوا اشارہ دہشت گری اور تشدد کی طرف کر دیا جائے جس نے ملک کو شکنجہ میں کس لیا ہے۔ نئے نئے اور مہلک ترین اسلحہ کی درآمد اور دستیابی اسی تصویر کا ایک رُخ ہے۔ اس نے فسادات کو اور زیادہ بھیانک بنا دیا ہے۔

شری سنجے گاندھی کے بیرونِ آئین اقتدار نے سیاست کے پنچ سے قدروں کو سرکانا شروع کر دیا تھا۔ یہ ابھی تک زور و شور کے ساتھ جاری ہے۔ چناؤ نے پہلے فرقہ واریت اور ذات پات کی آگ کو بھڑکایا اور آگے چل کر مافیا کے مقدّر کو چمکایا۔ جرائم کا ریکارڈ رکھنے والوں کو مجالسِ قانون ساز میں بار ملنے لگ گئی۔ کانگریس کی پیروی دوسری پارٹیوں نے کی۔ "جلد کو موٹا کرنے" اور حس کو کند کرنے اور شرافت کو بے دخل کرنے کا کاروبار زور پکڑ گیا۔ سیاسی پارٹیوں کی بُوتھ ونگ میں اراذل اور اوباشوں کو عزّت کا مقام دیا جانے لگا۔

مختصر یہ کہ مہاتما گاندھی نے سیاست میں دیانت اور اہنسا کو جو وقار دیا تھا وہ معزول ہو گیا، اور تہذیبی قدروں پر حیوانی جذبات غالب آنے لگے۔ نفسی نفسی اور دولت اندوزی اور اقدار سوزی کا کاروبار شروع ہو گیا۔ اس پر کوئی روک لگانے والا بھی نہ رہا۔ حالت ایسی ہو گئی جس میں کوئی چال ممنوع نہ رہی، کسی داؤ پر قدغن لگانا امکان سے باہر ہو گیا۔ جنگل کا قانون جنگل کی آگ کی طرح پھیلتا ہے۔ یہ قانون کمزوروں کی حفاظت نہیں کرتا بلکہ انھیں آگ کا ایندھن بنا لیتا ہے۔ اسی قانون کے تحت بابری مسجد منہدم کی گئی۔ یہی قانون ان فسادات کے برگ و بار لایا جو بہ یک وقت ہولناک اور شرمناک تھے۔ سورت کے تجارتی اور امن پسند شہر میں جس نے کبھی فساد کا منہ بھی نہیں دیکھا تھا، انسان نما درندوں نے گھروں میں گھس کر مردوں کو قتل کیا اور عورتوں کو برہنہ کیا (یُقَتِّلُونَ اَبناءَکُم وَیَستَحیُونَ نِسَاءَکُم)، عورتوں کا سڑکوں پر تعاقب کیا اور تصویریں کھینچیں اور ہزاروں کا مجمع اس تماشے سے لذت اندوز ہوتا رہا۔ کیا کوئی اس سے بدتر شقاوت کا تصوّر کر سکتا ہے۔ مسلمان پہلے سے زخم خوردہ ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ پولیس نے اپنی سنگینوں کا رخ مظلوموں کی طرف کر دیا ہے۔ لیکن

اس بار بمبئی میں یہ عمل اتنے بڑے پیمانے اور اتنی دلیری کے ساتھ ہوا کہ ہندستان کی گردن شرم سے جھک گئی۔ بمبئی میں شیوسینا کا راج تھا۔ مسلمان اور ان کے مکاں چُن چُن کر نذر آتش کیے گئے۔

بابری مسجد کے انہدام کی ذمّہ داری میں انتہا پسند ہندو، سرکار اور مسلمان رہنما شریک ہیں۔ ذمّہ داری سب سے زیادہ سرکار کی ہے، اس کے بعد ہندو انتہا پسندوں کی جو سنگھ پریوار کے نام سے جانے جاتے ہیں، آخر میں مسلم قیادت آتی ہے۔ مسلم قیادت کا بڑا قصور یہ تھا کہ اس نے آستینیں چڑھائیں، گلے پھاڑے اور جنگ کی تیاری کے اعلان کیے۔ اعلان ہوا میں بکھر گئے لیکن حریفوں نے ان اعلانوں کو ہندوؤں کو آمادۂ جنگ کرنے کے لیے بڑے پیمانہ پر ملک کے گوشہ گوشہ میں استعمال کیا۔ اگر ہمارے رہبروں میں ہوش و گوش ہوتا تو وہ قضیہ کو بے قابو ہونے سے پہلے ہندو قیادت سے مفاہمت کی بات کرتے اور شاید یہ مفاہمت ہو بھی جاتی۔ انھوں نے اندازہ ہی نہیں لگایا کہ سنگھ پریوار نے کتنے گہرے ڈھنگ سے اور کتنے بڑے پیمانے پر تیاریاں کی تھیں۔ یہ پریوار کیل کانٹوں سے لیس تھا اور ہمارے رہنما لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں۔ بغیر تیاری کے انھوں نے مسلمانوں کو میدان میں اُتار دیا بلکہ مسلم دشمن ہندوؤں کی عداوت کی آگ کو بھڑکا دیا۔ اس قیادت کا کچھ نہیں گیا۔ ہزاروں مسلمان شہید ہوئے، لاکھوں بے گھر ہوئے۔ جن کی بے عزتی کی گئی ان کا کوئی شمار نہیں لیکن ہمارے ایک رہبر ابھی تک مطمئن نہیں ہوئے تھے۔ انھوں نے ساری غارت گری کے بعد اسی مہینے سال میں اعلان کر دیا کہ مسلمان ری پبلک ڈے کا بائیکاٹ کریں۔ تناؤ پھر بڑھ گیا تناؤ کے اس خطرہ سے ڈر کر انڈیا ٹوڈے کے بقول سیکڑوں مسلمانوں کے گھر پھر اُجڑ گئے۔ یہ لوگ گھبرا کر بمبئی چھوڑ کر چلے گئے۔ گھر پہنچیں گے تو کون سے لہلہاتے کھیت ان کی آؤ بھگت کریں گے۔ کون سا دھندا ان کا انتظار کرتا ہوا ملے گا؟ محترم رہبر نے ہزاروں گھر برباد کر دیے۔ بے حسی کی کوئی حد ہوتی ہے۔

اور ہماری جہاں سوز قیادت کو اپنی تباہ کاری اور غیر ذمّہ داری پر ذرّہ برابر پشیمانی بھی نہیں ہوئی۔ کسی کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ بطور اقبالِ جرم استعفا دے دیتا۔ ایک صاحب نے استعفا دیا بھی تو بابری مسجد ایکشن کمیٹی سے نہیں دیا بلکہ سنٹرل وقف کونسل سے۔ ایسے استعفے کی کیا تُک تھی؟ اس استعفے میں ایک اور فریب پنہاں تھا۔ یہ حضرت سنٹرل وقف کونسل کی ایک عبوضی میں مامور ہوئے تھے۔ اس کی میعاد کبھی کی ختم ہوئی۔ مفت کرم داشتن۔ جس کونسل کے یہ رکن ہی نہ تھے اس سے استعفا دے کر انھوں نے کسے دھوکا دیا۔ خود کو، سنٹرل کونسل کو، ملک کو، یا مسلمانوں کو؟ یہ معیار ہے ان بزرگوں کی لیاقت اور دیانت کا۔ جن لوگوں

کے رہنما اتنے پُرفریب اور خودغرض اور آسایشی طلب ہوں، ان کا انجام یہی ہونا تھا جو ہوا۔ وہ اپنی صفائی میں یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ جب اوّل مجرم یعنی محترم وزیراعظم نے استعفا نہیں دیا تو ہم کیوں دیتے، غور کیجیے تو ان کا تعلق وزیراعظم کے گروہ سے ہے اس میں کسے شبہہ ہوگا۔ دونوں کے یہاں بے عملی، تاویل، تاخیر اور تذبذب اور کرسی نہ چھوڑنے کا چلن ہے۔

ہماری عام قیادت نے جو بابری مسجد کمیٹیوں سے زیادہ وسیع ہے ری پبلک ڈے کو منانے کے سلسلہ میں دانش کا ثبوت دیا لیکن اس کا یہ متفقہ اصرار کہ بابری مسجد اپنی پرانی جگہ پر کھڑی کی جائے زمینی حقیقتوں سے بالکل بے خبر ہونے پر گواہی دیتا ہے۔ اس اصرار سے کیا حاصل ہوگا؟ اگر کوئی مضبوط پرائم منسٹر ہوتا تو وہ بھی اس جگہ پر جہاں ارباب اقتدار کے اغماض سے مورتیاں رکھی گئیں مسجد تعمیر نہ کروا سکتا۔ بفرضِ محال حکومت وہاں مسجد تعمیر کرتی بھی ہے تو کیا ایک دوسری قیامت نہ برپا ہو جائے گی جس کی زد میں مسلمان ہی آئیں گے؟ ان حضرات نے کیا آنکھوں پر پٹیاں باندھ لی ہیں؟ راقم حروف کا تو صرف یہ کہنا ہے کہ وہ رہنما جو ایسے فیصلے کرتے ہیں جن کا انجام خوں ریزی ہوتا ہے اس انجام سے اپنا دامن کیوں بچاتے ہیں۔ انصاف کا تقاضا اتنا تو ضرور ہے کہ غلط فیصلہ کرنے والے یا ٹکراؤ کی طرف لے جانے والے کم سے کم اتنا نقصان خود اٹھائیں جتنا وہ لوگ اٹھاتے ہیں جو ان کے اثر میں آکر جان و مال سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ راقم فریاد کر رہا ہے کہ مسجد کو بچانے کے لیے ہم سے جو کچھ ہو سکتا تھا ہم نے کر لیا، جانیں دیں، عزتیں برباد کرائیں، روزگار سے گئے، ہماری ساکھ مٹی میں مل گئی، ہمارا بھرم ختم ہو گیا۔ اب ہم وہاں نئی مسجد بنوانے کے ذمّہ دار نہیں ہیں، نہ ہم اس کے لیے مکلّف ہیں۔ کیا ہم اتنا نہیں جانتے کہ ایک امید موہوم میں ایک زخم خوردہ ستم رسیدہ ملّت کو ایک بار پھر تختۂ مشق جور بنوانا گناہِ کبیرہ ہے۔ ہمیں تو یہ چاہیے کہ ہندوؤں سے اور سرکار سے، بلکہ اپنے سبھی اہل وطن سے یہ کہہ دیں کہ انتہائی زبردستی اور ناانصافی سے جنگل کے قانون کے تحت ہماری مسجد توڑ دی گئی اور ستم بالائے ستم ہندستان کے بہت سے شہروں میں ہمیں شہید یا برباد اور بے عزت کیا گیا۔ اب آپ جانیں، چاہے مسجد بنائیں چاہے نہ بنائیں، چاہے پرانی جگہ پر بنائیں چاہے کہیں اور بنائیں، ہم کو نہ چھیڑیں، ہم سے نہ پوچھیں، ہمارے زخموں پر نمک نہ چھڑکیں۔ ہم میں سے کوئی شخص جس کے دل میں ذرا سی بھی غیرت ہے مسجد کی نئی تعمیر میں نہ شریک ہوگا نہ دلچسپی لے گا۔ اب تو ہمیں اصرار کرنا چاہیے کہ جن لوگوں نے، پولیس کو شامل کرتے ہوئے، ہم پر مظالم توڑے ہیں ان کے خلاف فوری کارروائی کی جائے اور پولیس اور متعلقہ اسلحہ بردار دستوں میں جملہ اقلیتوں کو ملا کر پچاس فی صد

ملازمتوں کا تحفظ کیا جائے۔ جو لوگ اُکھڑ گئے ہیں ان کی باز آباد کاری امن وسکون کے ساتھ وہیں پر کی جائے جہاں سے وہ اکھاڑے گئے ہیں۔

اور خود مسلمانوں کو ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کی منظم کوشش کرنی چاہیے جو ان کے متعلق ہندوؤں میں پھیلائی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کے اندازِ فکر میں ایسی تبدیلی لانا چاہیے کہ اس ملک میں ان کا احترام ہو اور غیر مسلموں کے دلوں میں اُن کے لیے جگہ ہو جائے۔

علاوہ بریں مسلمانوں کو پارٹیوں میں بائیں بازو کی پارٹیوں اور فرقوں میں اقلیتوں درجِ فہرست ذاتوں اور قبیلوں، اور کمزور طبقوں سے دوستی کرنی چاہیے۔ اس میں وقت ضرور لگے گا، پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑے گا، مضمرات اور نیات کو ٹٹولنا پڑے گا۔ لیکن کام یہ کرنے کا ہے۔ اسے سلیقہ سے انجام دیا گیا تو اقلیت اکثریت بن جائے گی اور اکثریت اقلیت میں تبدیل ہو جائے گی۔ اس قسم کا الحاق بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا۔

مولانا وحید الدین خاں صاحب نے حال ہی میں تصفیہ کی خاطر ایک سہ نکاتی فارمولا پیش کیا ہے۔ ان میں سے بعض نکات و خیالات (در اصل بنیادی خیال) راقم سطور کے مضامین میں، اور بعض دلائل بھی، پیش کیے جا چکے ہیں۔ لیکن میرا موقف یہ ہے کہ اس وقت مسجد کی بات ہی نہ کرنی چاہیے۔ اب سوال مسجد کا نہیں، ہندستان میں مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں اور سیکولر اور جمہوری نظام کی بقا کا ہے۔ ہمیں ہندوؤں سے نہیں ٹکرانا ہے بلکہ منظم ہو کر بسطائی طاقتوں کو پیچھے دھکیلنا ہے۔ بابری مسجد کو ہم ملک کے ضمیر کے حوالے کرتے ہیں۔

پریس اور صحافیوں نے بے خوف حق گوئی کی لاج رکھ لی ہے۔ اقلیتیں اور روشن خیال جماعتیں ان کی رہینِ منت ہیں اور وطن پچاس سال کے بعد جب پیچھے مڑ کر دیکھے گا تو احسانمندی کے ساتھ ہمارے قومی پریس کو یاد کرے گا۔ یہ بات بھی قابلِ داد ہے کہ باوجود مذہبی جنون کے ہندستان میں قابلِ لحاظ تعداد میں ایسے ہندو موجود ہیں جو حق اور انصاف کی بات کہنے کی ہمت رکھتے ہیں۔ جرأت اور بصیرت کے ساتھ حق اور انصاف کی بات کہنے والے اتنے مسلمان نہیں ملیں گے۔

کٹر پنتھی، متعصب، کور باطن اور تنگ نظر لوگوں کے اقتدار میں آ جانے سے نقصان سب اقلیتوں کو تو پہنچے گا ہی، اس سے بھی زیادہ جراحت اکثریت اور قوم کے حصہ میں آئے گی۔ دھرماندھ کا راج ہو جائے تو وقت کی مشین الٹی چلنے لگتی ہے۔ اس کی سوئیاں آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے کی طرف چلتی ہیں۔ سائنس کا مزاج سیکولر جمہوری، روشن اور کشادہ ہوتا ہے۔ جہاں فکر اور اظہار کی آزادی ہو، جہاں جستجو اور تحقیق بندشوں سے آزاد ہو، وہاں علوم اور ٹکنولوجی

فروغ پاتے ہیں۔ سنگھ پریوار کی لائی ہوئی ترقیٔ معکوس بھارت کو بہت مہنگی پڑے گی۔

ایک وقت وہ تھا، اور اسے زیادہ دن نہیں ہوئے، جب ملک کا ایک طبقہ جو کانگریس کی دو رُخی، ریاکاری اور بے ایمانی سے اُکتا گیا تھا، بھاجپا کی طرف حسرت اور عقیدت سے دیکھنے لگا تھا اس امید میں کہ یہ پارٹی اخلاق اور اقدار کو بحال کرے گی۔ لیکن ایودھیا کے بڑے المیہ کے سلسلہ میں اس نے جو پیماں شکنیاں کیں، جس طرح زبان بدلی، جس انداز سے ملک اور قوم کو دھوکے دیے، جس طرح الفاظ کے مفاہیم تک بدل ڈالے، جس طرح تشدد کی آگ کو بھڑکایا، اس نے بہت سے دلوں سے حسرت اور عقیدت کو نکال کر وہاں بدگمانی اور حقارت اور کدورت کو بٹھا دیا ہے۔

اگست ۱۹۹۰ء میں شری اڈوانی نے ایک تقریر کے دوران یہ پیشکش کی تھی کہ مسلمان بابری مسجد کو احترام کے ساتھ منتقل کرنے پر راضی ہو جائیں تو دوسری متنازعہ مساجد سے دعوا ہٹا لینے کے لیے ہندوؤں کو رضامند کیا جا سکتا ہے۔ اس بیان میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے تین سابق وائس چانسلروں، کرنل بشیر حسین زیدی مرحوم، بدرالدین طیب جی اور سید حامد نے روشنی کی ایک کرن دیکھی۔ انھیں محسوس ہوا کہ اس طرح شاید وہ قیامت جو افق پر نظر آرہی ہے ٹل جائے، لہٰذا انھوں نے شری اڈوانی کو ایک خط لکھا اپنے تینوں کے دستخطوں کے ساتھ اور خواہش ظاہر کی کہ وضاحت کے لیے وہ شری اڈوانی سے ملنا چاہیں گے۔ ایسا لگتا ہے کہ شری اڈوانی کو یہ مشورہ دیا گیا کہ اس پیش کش کو آگے نہ بڑھائیے کہ یہ ہمارے پروگرام کی راہ میں حائل ہو جائے گی۔ چنانچہ انھوں نے اس خط کا جواب تک نہیں دیا۔ اور ملک نے مفاہمت کا ایک زرّیں موقع اس طرح کھو دیا۔

میں نے اپنے رہنماؤں کو بھی اس سلسلہ میں خط لکھے، لیکن ایسا لگتا ہے کہ میری تجویز کو انھوں نے بھی پسند نہیں کیا۔ وہ تکفیری فقیری اور بحثا بحثی کے ماحول سے اوپر نہ اٹھ سکے۔ قارئین کی واقفیت کے لیے ان خطوط کے تراجم مندرجہ ذیل سطور میں شامل ہیں۔ تمہید کے بعد وہ مضامین نقل کیے گیے ہیں جو راقم سطور نے بابری مسجد کے ضمن میں لکھے اور جو ملک کے مختلف اخباروں میں شائع ہوئے، بالخصوص قومی آواز (دہلی) آزاد ہند (کلکتہ) انقلاب (بمبئی) سیاست (حیدرآباد) اور سالار (بنگلور) میں۔ اس کتاب کو پڑھنے سے کچھ اندازہ اس امر کا ہو جائے گا کہ مسلمانوں نے اس قضیہ کو جذبات کے دھند لکے میں دیکھا، عقل کی روشنی میں دیکھا ہی نہیں۔ انھوں نے ایک پل کو یہ نہیں سوچا کہ ایسے ملک میں جہاں آبادی مخلوط ہو اور اغیار کی کثرت ہو، اسلام کی فروعات کی تفسیر و تعبیر

کے انداز مختلف ہونے چاہییں اور بڑے فتنہ سے بچنے کے لیے چھوٹے فتنہ کو گوارا کر لینا چاہیے۔ برہمی اور بدگمانی کی فضا میں کسی شخص کا رائے عامہ سے اختلاف یا انحراف کرنا بہت دشوار اور پُرخطر ہو جاتا ہے۔ راقم سطور نے تاہم اختلاف کیا اور اپنے رہنماؤں سے منّت سماجت کی، فریاد کی کہ اُس طوفان کی زد سے اس ملّت کو بچائیں جس کی گڑگڑاہٹ اسے سنائی دینے لگی تھی۔ رہنماؤں نے شاید اس خوف سے کہ عوام بابری مسجد کو ہٹائے جانے کی بات سننے کو تیار نہ ہوں گے میری بات کو زیادہ وزن نہیں دیا۔ یہ اعتراض میری بات پر ضرور کیا جا سکتا ہے کہ مسٹر اڈوانی نے تو صرف جائزہ لینے کو کمند پھینکی تھی اور وضاحت چاہی گئی تو وہ پیچھے ہٹ گئے لیکن اگر اس پیش کش کو مسلم رہنماؤں کی تائید حاصل ہو جاتی تو ان کے لیے پیچھے ہٹنا مشکل ہو جاتا اور اگر وہ ہٹ بھی جاتے تو مسلمانوں کے خلاف رام جنم بھومی کو لے کر وہ فضا ہرگز نہ تیار کر پاتے جس نے پہلی بار رتھ یاترا کے جلوس میں جا بجا خوں ریزی کی شکل اختیار کی اور دوسری بار جس نے نہ صرف مسجد کو منہدم کر ڈالا بلکہ مسلمانوں کو تہِ تیغ اور بے آبرو کیا اور ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ عزّت کے ساتھ مصالحت کا موقع دراصل اسی وقت تھا جب اگست ۹۰ء میں مسٹر اڈوانی نے سرِمنبر یہ پیش کش کی تھی۔

ایک سوال اور باقی رہتا ہے۔ وہ شخص جس نے مسجد کو منتقل کرنے پر ہامی بھری تھی اس کے انہدام پر اس قدر بے چین اور بے تاب کیوں ہو گیا۔ اس کے ضبط کا پیمانہ چھلک کیوں گیا۔ غم و غصّہ میں وہ چلّانے کیوں لگا؟ اس لیے کہ اس کی عزت کو پاؤں تلے روندا گیا۔ اسے سرِبازار رسوا کیا گیا، اس کی آبرو کو خاک میں ملا دیا گیا، اس کو بہ جبر ذلیل کیا گیا، اس کی عبادت گاہ کو فاتحانہ اور متکبّرانہ اور منتقمانہ انداز سے زمیں بوس کر دیا گیا۔ پہلی بار منتقلی دونوں فریق کی رضامندی سے ہوتی۔ اس بار انہدام اس انداز سے کیا گیا کہ ایک فریق کو فتح ہوئی اور دوسرے فریق کو شکست۔ ناکردہ گناہوں کا بدلہ لیا گیا اور کتنے ذوق و شوق اور غرور و افتخار کے ساتھ کہا گیا کہ غلامی کا نشان مٹا دیا گیا۔ کارسیوکوں اور ان کو بھڑکانے والوں کو خبر بھی نہیں کہ ان کی غلامی تو بابری مسجد کے انہدام کے ساتھ شروع ہوئی ہے۔ انھوں نے غیظ و غضب، تکبّر اور انتقام اور جہالت کی غلامی قبول کی ہے۔ ایک ایسی تاریخ کے وہ حلقہ بگوش بن گئے ہیں جس کی صحت سخت مشتبہ اور جس کا غلط ہونا ثابت ہے۔ مستقبل کو منزلِ مقصود بنانے اور اسے سنوارنے اور سدھارنے کے بجائے وہ ماضی (اور وہ بھی رہ گم کردہ اور زخم خوردہ ماضی) کے غلام بن گئے ہیں۔ ان کی قوت بازو اب ترقیٔ معکوس کے حصول میں صرف ہو رہی ہے۔ یہ لوگ اختیار پا گئے تو آزادیٔ فکر و اظہار کو پنپنے نہ دیں گے اور ملک کو تاریکی میں دھکیل دیں گے

کمزوروں اور پچھڑے ہوؤں کو سانس لینے کی اجازت نہ ہو گی۔ مذہب اور بھاشا کو یہ استبداد کا آلہ کار بنائیں گے۔ ایسے تنگ نظروں کے تحت ملک اپنی سالمیت کھو بیٹھے گا۔ یہ دَور دراصل مذہبی ریاستوں کا ہے ہی نہیں اور ہندستان جیسے کثیر المذاہب کثیر اللسان اور کثیر الافکار ملک کے لیے تو مذہبی ریاست سخت ناموزوں ہے۔ بھاجپا کے ترجمان زبانی چابکدستی کے جوہر دکھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ مذہبی ریاست قائم نہیں کریں گے، حالانکہ اگر کہیں ان کے ہاتھوں میں زمامِ اختیار آگئی تو لیبل کے علاوہ سارے اوصاف مذہبی ریاست کے ہوں گے اور مذہبی ریاست بھی وہ جو انتقام کے جذبے اور نفرت پر مبنی ہو۔ ایسی ریاست کو ہمیں وجود میں آنے سے ہر قیمت پر روکنا ہے۔ کیونکہ ایک بار اگر بی جے پی مرکز میں متمکن ہوگئی تو دوبارہ چناؤ کی نوبت نہیں آئے گی۔ ان کا دستور یہی رہا ہے کہ ریاست کو پارٹی کے مقاصد کے لیے بے حجابی کے ساتھ استعمال کریں اور اس کی انتظامیہ میں سنگھ پریوار کو داخل کر دیں، پیوست کر دیں، تاکہ اگر اتفاقاً کوئی دوسری حکومت برسرِ اقتدار آجائے تو بھی بھاجپا کا ہی نقطۂ نظر حاوی رہے اور اہلکار اسی کے مقاصد کے حصول کو ہدفِ آمال بنائے رکھیں۔ بھاجپا کا ہدف اس وقت مسلمان ہیں، ایک بار اُن کو زیر کر لیا تو دوسری اقلیتیں خود سرنگوں ہو جائیں گی۔ اس وقت سوال مسلمانوں کی حفاظت کا نہیں ملک کی سالمیت، اس کے تمدن، اس کے ضمیر اور اس کی روح کے تحفظ کا ہے۔ اگر سنگھ پریوار ستارو ڑھ ہو گیا تو امن وامان بھی پارہ پارہ ہو جائے گا، اس کی دھجیاں بکھر جائیں گی۔ حیرت ہے کہ سنگھی دانشمندوں کو جنھوں نے ریسرچ کو ناانصافی اور ظلم کی کنیز بنا رکھا ہے، دیوار کی تحریر بھی نظر نہیں آتی۔ لیکن ملک برباد ہوا تو ان کا کیا جائے گا جو دھر ماندھ میں بھٹک رہے ہیں جن کی نگاہ ماضی کی طرف ہے۔ نقصان تو ہمارا ہوگا کہ ہماری امیدیں، آرزوئیں، تمنائیں اور عزائم ایک روشن، پیش رفت خو، انصاف جو، فراخ مشرب ملک کے مستقبل سے وابستہ ہیں۔

ٹائمز آف انڈیا۔ شری اڈوانی کی طرف سے نئے مختارات کی نشان دہی۔

۱۳ اگست ۱۹۹۰ء، "رام جنم بھومی بنام بابری مسجد"، کتاب کا اجرا کرتے ہوئے شری اڈوانی نے کہا۔

"..... میں مسلمان رائے عامّہ کے سربراہوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ رام جنم بھومی کے بارے میں ہندوؤں کے شدید جذبات کا اندازہ کریں اور وشو ہندو پریشد کے رہنماؤں سے تعاون کریں تاکہ بابری مسجد کی باقیات کو قریب ہی احترام کے ساتھ منتقل کیا جاسکے اور وہاں ایک معقول مسجد بنائی جائے اور اس جگہ پر جس کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ وہاں رام کی جائے پیدائش ہے، شری رام کے شایانِ شان مندر کی تعمیر کی جائے۔ اتنی خوش دلی کے ساتھ بنائی ہوئی مسجد اور مندر ہندوؤں اور

مسلمانوں کے درمیان ہم آہنگی اور اعتماد کی نشانی بن جائے گی"۔ جلسہ کی صدارت شری گری لال جین کر رہے تھے۔

مسٹر اڈوانی نے کہا کہ وہ یہ پیش کش اس لیے کر رہے ہیں کہ "مسلمان رائے عامہ کا یہ خوف زائل ہو جائے کہ اس طرح کے تبادلہ کا معاہدہ کہیں اور جگہوں مثلاً وارانسی اور متھرا میں اسی قسم کے مطالبات کے دروازے نہ کھول دے ..... مسئلہ یہ نہیں ہے کہ رام وہاں پیدا ہوئے تھے یا نہیں۔ (نفس مسئلہ) یہ مضبوط عقیدہ ہے کہ رام اسی جگہ پیدا ہوئے تھے اور وہاں پر ایک مندر تھا جو مسمار کر دیا گیا.... اب پیش قدمی مسلمانوں کو کرنی ہے۔

یہ مسئلہ ایسا ہے جسے عدالت طے نہیں کر سکتی۔ اس وضع کا مسئلہ یا تو فریقین کے درمیان اتفاق رائے سے سلجھ سکتا ہے یا سرکار کے فیصلے سے یا قانون سازی سے عدالتی مقدمہ سے نہیں"۔

(شری اڈوانی کے نام انگریزی خط کا ترجمہ) ۱/۲۳ شانتی نکیتن ۔ نئی دہلی
۲۳ اگست ۱۹۹۰

ڈیر شری اڈوانی

ہم نے رام جنم بھومی / بابری مسجد قضیہ کے بارے میں آپ کے اس بیان کو بہت دلچسپی سے پڑھا جو ۱۴ اگست کے ٹائمز آف انڈیا میں شائع ہوا ہے اس کی بنا پر ہم یہ سمجھ رہے ہیں کہ اگر مذکورہ قضیہ طے ہو جائے تو ان ساری عبادت گاہوں کی حیثیت جو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو موجود تھیں ویسی ہی برقرار رہے گی اور اس کو بدلنے کی کوئی کوشش نہیں کی جائے گی۔ ہمیں محسوس ہو رہا ہے کہ آپ کے بیان کی بنیاد پر تصفیہ ہو سکتا ہے۔ ہمیں یہ احساس بھی ہے کہ فریقین کو بہت کچھ کام رائے عامہ کو، ایک منصفانہ اور دوستانہ سمجھوتے کے حق میں ہموار کرنے کے لیے کرنا پڑے گا۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ ایک ایسے مسئلہ میں جس کی نوعیت جذبات سے گہرا تعلق رکھتی ہے جیتنے یا بازی لے جانے کا جذبہ کارفرما نہیں ہونا چاہیے۔

وسیع تر قومی مفاد میں یہ ضروری ہے کہ ایسا تصفیہ عمل میں آئے جو دونوں فریق کو برضا و رغبت منظور ہو۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ ماضی کے طویل مذاکرات ناکام ہوئے، لیکن اس وجہ سے ہمیں ہاتھ نہیں روکنا چاہیے۔ آپ چونکہ آپ نے ذاتی طور پر پیش قدمی کی ہے، اس لیے تصفیہ کے امکانات روشن ہو گئے ہیں۔ اگر آپ کو منظور ہو تو ہم آپ کی سہولت کے مطابق آ کر آپ سے ملیں اور توضیح طلب گفتگو کریں۔ ہماری ابتدائی گفتگو کے نتیجہ میں

وسیع پیمانے پر اس تجویز کے لیے رائے عامہ تیار کی جا سکتی ہے۔
مذکورہ بالا پتا پر ہم آپ کے جواب کی توقع کریں گے۔

آپ کے مخلص

بدر الدین طیّب جی	سید حامد	ڈاکٹر (کرنل) بشیر حسین زیدی
ٹیلی فون نمبر ۶۷۰۳۹۱	فون نمبر ۶۴۳۴۱۱۹	فون ۶۳۱۶۴۸

شری اڈوانی کے نام مذکورہ خط کی ترسیل سے صرف پانچ دن قبل مندرجہ ذیل خط اردو اخبارات میں اشاعت کے لیے جاری کیا گیا۔

ہمدرد نگر۔ نئی دہلی

۱۸ اگست ۱۹۹۰ء

"مسٹر لال کرشن اڈوانی نے حال ہی میں بابری مسجد نزاع کے بارے میں ایک پیشکش کی ہے جو ہندو مسلم تعلقات کو ایک نیا رخ دے سکتی ہے۔ بادی النظر میں یہ ایک ایسا موقع ہے جسے ہمیں ہاتھ سے جانے نہ دینا چاہیے۔

ہم کم سے کم یہ تو کر ہی سکتے ہیں کہ اس پیشکش کا برملا جواب دیں اور شری اڈوانی کے ساتھ بات چیت شروع کریں۔ اگر جو کچھ ان کی زبان سے نکلا ہے وہ حسن نیت سے کہا گیا ہے تو اس کا جواب نہ دینے کی صورت میں ہم ہندوؤں کے ساتھ اپنے روابط استوار کرنے کا ایک زرّیں موقع ہاتھ سے دے بیٹھیں گے۔ اس قسم کا موقع دوبارہ نہیں آتا۔ ہمیں یہ بات ہرگز نہ بھولنی چاہیے کہ ہندو مسلمان کی باہمی تلخی کو طول دینا اور اس کی دھار کو تیز کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارا مستقبل برباد ہو جائے گا۔ کیا ہم چاہیں گے کہ ہماری آنے والی پیڑھیاں لگاتار ناسلامتی اور محرومی کے حیات سوز اور روح فرسا طلسم میں گرفتار رہیں۔ بہر حال بابری مسجد ان بیسیوں مسجدوں سے زیادہ مقدس نہیں ہے جن پر دوسروں کا غاصبانہ قبضہ ہے۔ مسٹر اڈوانی نے ایک پہل کی ہے، ہمیں اس کا جواب دینا چاہیے۔ انھوں نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ مسجد کو پورے احترام کے ساتھ کہیں قریب ہی میں منتقل کر دیا جائے۔ ان کا کہنا ہے کہ دونوں عبادت گاہوں کا باہمی قرب آنے والی نسلوں کے لیے ہندو مسلم تعلقات کی خوش گواری کی علامت بن جائے گا۔

مجھے ایسا لگتا ہے کہ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہماری ملت میں کسی شخص کا اس قدر احترام نہیں ہوتا جتنا احترام ہندوؤں کے اندر شری اڈوانی کا ہے۔ اس کمی کو ہم اس طرح دور کر سکتے ہیں کہ مل کر شری اڈوانی کو جواب دیں۔ ہم میں سے کچھ لوگ

کہہ رہے ہیں کہ یہ پیش کش بہت مبہم ہے، دوسرے کچھ لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ پیشکش اتنی اچھی ہے کہ یہ باور نہیں ہوسکتی۔ بات چیت ابہام کو دور کرسکتی ہے اور پیش کش کو ٹھوس اور قابلِ عمل بنا سکتی ہے۔

سب سے بدتر امکان کا جائزہ لیجیے۔ اگر مذاکرات ناکام ہوتے ہیں تو نہ ہمیں نہ تاریخ کو اس کا افسوس ہوگا کہ ہندستانی مسلمانوں نے کم نگاہی اور بے بصری کی بنا پر شبہہ کے تحت ایک ایسی پیش کش کو ٹھکرادیا جو کنجی تھی مستقبل میں ان کی سلامتی اور خوش حالی کی۔

اس لیے میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ مسلم رائے عامّہ کے ایک معتبر لیڈر کی حیثیت سے شری اڈوانی کو لکھیں کہ آپ ان کے ضمن میں ان سے بات چیت کرنا چاہتے ہیں۔ آپ اس پر بھی غور فرمائیں کہ برملا یہ اعلان کر دیا جائے کہ آپ اس قضیہ کو خوش دلی کے ساتھ طے کرنے کے اس موقع کا خیر مقدم کرتے ہیں، اس تحفّظ کے ساتھ کہ یہ گفت گو کسی عنوان عدالت میں ہمارے مقدمہ پر اثر انداز نہیں ہوگی۔

وزیر اعظم وشوناتھ پرتاپ سنگھ فی الوقت بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے اراکین سے مل رہے ہیں۔ ہم ان کی کامیابی کی دعا کرتے ہیں۔ لیکن اس وقت جس شخص سے ملنا چاہیے وہ شری اڈوانی ہیں۔ جو ہندوؤں کی اکثریت کی ترجمانی صراحت اور اعتماد کے ساتھ کر سکتے ہیں۔

ہمیں اس جھگڑے کو طے کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے کیونکہ اس نے دونوں فرقوں کے درمیان اتنی بڑی خلیج پیدا کر دی ہے جو اس سے پہلے کبھی وجود میں نہیں آئی تھی۔ اس پیش کش کو قلم برداشتہ رد کر دینا یا اسے نظر انداز کرنا قوتِ فیصلہ کے دیوالیہ پن کی وجہ سے ہوسکتا ہے یا ارادہ کے مفلوج ہونے کی بنا پر یا بے بصری کے باعث، یا ان تینوں کے کارن۔

اخبار میں جس طرح شری اڈوانی کا بیان چھپا ہے، اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہندو آیندہ کسی مسجد پر دعوا نہیں کریں گے۔ سوال کیا جاسکتا ہے کہ اگر آنے والی پیڑھیاں ایک دوسرا رُخ اختیار کرلیں تو کیا ہوگا؟ جواب صاف ہے: اوّل تو یہ ہندو بھارت کا پکا پیمان ہوگا جس سے ہندوؤں کی آیندہ نسلیں پیچھے نہیں ہٹ سکتیں، دوسرے حکومت اس تصفیہ کو قانونی شکل دینے میں تامّل نہیں کرے گی۔

آئیے اب ہم دوسرے (یا متبادل) راستہ پر غور کریں یعنی عدالت کے فیصلہ پر اصرار۔ مقدّمہ غیر معیّنہ مدّت تک طول کھینچ سکتا ہے اور فیصلہ جب کبھی بھی ہو، یا تو مسلمانوں کے حق میں ہوگا یا ان کے خلاف۔ پہلی صورت میں ہم

مسجد بھی کھو بیٹھیں گے اور ہندوؤں کی خیر اندیشی بھی۔ دوسری صورت میں ہمارا سامنا ہندوؤں کی بڑھی ہوئی بد اندیشی سے ہوگا۔ گمانِ غالب ہے کہ اجودھیا کی ہار سے کھسیا کر وہ متھرا اور کاشی اور دوسرے مندر مسجد قضیوں کے باب کو ز روئے انتقام کھول ڈالیں گے۔ علاوہ بریں فسادوں کی باڑھ سی آجائے گی۔ جو حشر برپا ہوگا اس کے لیے ذمہ داری کس پر جائے گی؟ قضیہ اور کشیدگی کئی گنا بڑھ جائے گی، اس کے نتیجہ میں بد نصیب مسلمان ایک عرصے تک اپنی تعمیرِ نو کی طرف دھیان نہ دے سکیں گے۔ اپنے جھنجھلائے ہوئے اور بخیل اہلِ وطن سے انھیں ناانصافی ملتی رہے گی اور یہ امکان کہ وہ اپنے اہلِ وطن کے برابر آسکیں ہمیشہ کے لیے ان کی گرفت سے نکل جائے گا۔

ہماری تاریخ میں یہ ایک لمحہ ایسا آیا ہے جب جرأت کے ساتھ قدم بڑھانے اور تخیّل کے ساتھ فیصلہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر ہمارے پیر ٹھنڈے ہونے لگے، اگر ہمیں یہ خوف لاحق ہوگیا کہ ہم اپنے ماننے والوں میں مقبولیت کھو بیٹھیں گے، اگر ہم ایک موافق عدالتی فیصلہ کے امکان سے لذت اندوز ہوتے لگے، اگر ہم نے مسٹر اڈوانی کی پیش کش پر یہ سوچتے ہوئے کہ یہ ایک چال یا داؤ ہے، مکمل بے اعتمادی کا اظہار کیا تو ہم ایک ایسا موقع کھو دیں گے جو پھر کبھی نہیں آئے گا۔

میری التجا کو یہ کہ کر نظر انداز کر دینا کہ یہ مسئلہ بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے دائرہ فکر و عمل میں آتا ہے، دانش مندی نہ ہوگا۔ اگر آپ کے دائرہ فکر میں یہ مسئلہ نہیں آتا تو کس کے دائرہ فکر میں آئے گا؟ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس سے ہر ہندستانی مسلمان کا تعلق ہے۔ وہ آپ کی طرف پہل کے لیے دیکھ رہے ہیں۔ میں اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ ابھی ایسی پیش کش پر شادمان ہونے کا کوئی موقع نہیں جس کی باریکیاں اور مضمرات ہنوز واضح نہیں ہیں۔ میری التجا تو صرف یہ ہے کہ ہمیں ایسی پیش کش کا جواب ضرور دینا چاہیے جسے عام طور پر خیر خواہانہ اور تعطل شکن سمجھا جائے گا۔ ہمیں اس کے مضمرات پر غور کرنا چاہیے اور گفتگو کے بہم ردّ و قبول کے ذریعہ ایک ایسے تصفیہ کو ترتیب دینا چاہیے جو دونوں فرقوں کے ساتھ انصاف کرتا ہو اور جو فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی سمت میں ایک مثبت قدم ثابت ہو سکے۔"

احترامات کے ساتھ

آپ کا مخلص سید حامد

جیسا کہ ذکر آچکا ہے راقم سطور کی کوششیں رایگاں گئیں۔ اس نے شری اڈوانی کے بیان پر جو اعتماد کیا تھا وہ غلط ثابت ہوا۔ بعد کے تجربات سے یہ

بات کھل کر سامنے آگئی کہ شری اڈوانی نے یہ پیش کش حسن نیت کے ساتھ نہیں کی تھی۔ بلکہ ایک سیاسی چال یا پتنگ اڑاتے یا کمند پھینکنے کے طور پر کی تھی۔ ان کا مقصد یہ ٹٹولنا تھا کہ بابری مسجد کے مسئلہ میں مسلمان کس حد تک مفاہمت پر آمادہ ہیں۔ وائس چانسلروں کے جب ان سے گفت گو کرنا چاہی تو وہ صاف کترا گئے۔ انھوں نے سوچا ہو گا کہ شیوخ الجامعہ بغیر وضاحت حاصل کیے دم نہ لیں گے، اور وضاحت کرنا خود کو باندھ دینے کے برابر ہوگا اور ان کی فراست ذہنی نقل وحرکت اور زبان و بیان کی آزادی اور موقف کی تبدیلی پر کوئی بندش قبول کرنے کو تیار نہیں تھی۔ ان کے ساتھیوں نے اڈوانی صاحب کو سمجھایا ہوگا کہ یہی قضیہ تو ہماری کھیتی ہے۔ ایک کھیت سے وہ کئی فصلیں لینا چاہتے تھے۔ اب پیچھے مڑ کر دیکھیے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ ان کا مفاد اس قضیہ کو طے کرنے میں نہیں اسے زندہ رکھنے میں تھا۔ یہ جھگڑا سلگتا رہا تب وہ ہاتھ سینک سکیں گے۔ اس کی بدولت انھوں نے بڑی آن بان کے ساتھ اپنے وہم وگمان کو بہت پیچھے چھوڑ کر، حیرت انگیز کامیابی عام چناؤ میں حاصل کی۔ اس کے بعد خود ان کا حوصلہ اور وشو ہندو پریشد اور بجرنگ دل کا دباؤ بڑھتا چلا گیا اور نتیجہ کیا نکلا؟ بابری مسجد کی بھیانک اور شرمناک شہادت۔ بابری مسجد کے انہدام پر سنگھ سنگٹھن خوش ہیں اور فخر محسوس کر رہے ہیں۔ فی الحال وہ سستا رہے ہیں، دم لے کر آگے بڑھیں گے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کی کمر ٹوٹ گئی ہے، اب وہ سر نہیں اٹھائیں گے۔ ہیکڑی چھوڑ کر ہمارے سامنے سرنگوں ہو جائیں گے۔ ہماری ہاں میں ہاں ملائیں گے۔

آج سے تین سال پہلے جب کشت وخون اور غارت گری کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔ راقم سطور کو یہ خوف لاحق تھا کہ اگر فیصلہ نہیں ہوا تو گھی تیاریاں رنگ لے آئیں گی اور ہزاروں مسلمان خاک وخون میں مل جائیں گے۔ اس کی بات بھاجپا نے نہیں سنی کہ یہ ان کے عزائم اور منصوبوں کو خاک میں ملا دیتی، مسلمانوں نے نہیں سنی کہ انھیں نہ ہندوؤں کی کدورت کی شدّت کا اندازہ تھا، نہ ان تیاریوں کا جو وہ سالہا سال سے کرتے چلے آئے تھے۔ رتھ یاترا کی خون آشامیوں کے زیر اثر سب سے بڑا نقصان، جان و مال سے بھی بڑا نقصان، مسلمانوں کے حوصلے اور اعتماد کا ہوا۔ انھوں نے پی اے سی کی گولیاں کھائیں اور انھیں سرکار سے انصاف کی امید نہ رہی۔ رہا سہا حوصلہ ایودھیا بمبئی، سورت اور احمد آباد نے ختم کر دیا۔ سنگھیوں نے جو کھیتی عداوت اور نفرت کی بوئی تھی وہ لہلہانے لگی۔ سمجھ دار کسان کچّی فصل کبھی نہیں کاٹتا۔ چنانچہ وہ اپنے اعلان و پیمان سے کنارہ کش ہو گئے۔ کچھ عرصہ کے بعد ٹائمز آف انڈیا میں ہی ایک خط چھپا

جس میں کہا گیا کہ شری اڈوانی کی تقریر غلط ڈھنگ سے رپورٹ کی گئی تھی انھوں نے ایسی بات نہیں کہی تھی ۔ لیجیے قصّہ ختم ہوا اور روشنی کی آخری کرن رخصت ہوگئی، اندھیرا چھاگیا۔ بابری مسجد کے انہدام کے بعد مولانا وحیدالدین خاں کی حالیہ پیش کش کے ضمن میں یہ کہا گیا کہ بقیہ نزاعی مساجد کے بارے میں اس قسم (ضمانت تحفظ) کی تجویز بھاجپا نے پہلے ہی رکھی تھی، مسلمانوں نے اسے منظور نہیں کیا۔

سطورِ و اقتباساتِ بالا سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ بی جے پی کے رہنما یہاں غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں۔ مسٹر اڈوانی نے پیش کش ضرور کی لیکن جیسے ہی انھیں اندیشہ ہوا کہ مسلمانوں کی طرف سے اس کے قبول کا امکان پیدا ہو رہا ہے، انھوں نے دم سادھ لیا۔ اس وقت اگر ہماری قیادت نے اس تجویز میں دلچسپی کا اظہار کیا ہوتا تو بات کھل کر سارے ملک کے سامنے آجاتی۔ کیا عجب کہ ایسی صورت میں بھاجپا کو ایک حد تک مجبور ہونا پڑتا۔ اور بہرکیف عدم تعاون اور ہٹ دھرمی کے دھبّے تو مسلمانوں کی جبیں پر نہ لگتے۔ نہ بھاجپا کو مسلمانوں کے خلاف پرچار میں ان کے مبیّنہ عدمِ تعاون کو استعمال کرنے کا موقع ملتا۔

یہ بات سب جانتے ہیں کہ بابری مسجد کیا ٹوٹی مسلمانوں کے دل ٹوٹ گئے۔ مسجد تو اب جُڑ نہیں سکتی کہ ظالموں نے اُسے زمین بوس کر دیا لیکن دل تو جوڑے جا سکتے ہیں، حوصلے کو تو بحال کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت یہی کام کرنے کا ہے حوصلہ اگر پست ہوگیا تو بچا کیا؟ زندگی عبارت ہے دلِ زندہ سے حوصلہ ٹوٹتا ہے تو چھکّے چھوٹ جاتے ہیں۔ انھیں اپنی راکھ سے پورے اعتماد کے ساتھ اُٹھ کر کارزارِ ہستی میں اتر آنا چاہیے۔ کوئی وجہ نہیں مایوس اور بددل ہونے کی۔ مسلمانوں پر اس سے بڑی مصیبتیں پڑی ہیں۔ انھوں نے کروٹ لی ہے اور اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اس بار بھی اٹھیں گے انشاء اللہ اور نئی شان سے اٹھیں گے۔

ضبط اور تنظیم کی ضرورت

بابری مسجد رام جنم بھومی جھگڑے نے ملک بھر میں آگ لگا دی ہے۔ ہندستان کی آزادی اور تقسیم کے وقت جنون اور خوں ریزی (خدا نہ کرے کہ اس پیمانے پر ان کا پھر کبھی اعادہ ہو) بڑی حد تک شمالی ہندستان میں محدود رہی۔ اس وقت یہ سارے ملک میں پھیل گئی ہے۔ اترپردیش، مدھیہ پردیش، گجرات، کیرالا، کرناٹکا، آندھرا پردیش میں تعصب اور تشدد کا دور دورہ ہے۔ فرقہ وارانہ تناؤ سے کوئی حصہ ملک کا محفوظ نہیں ہے۔ تناؤ میں انسان سوکھی لکڑی اور سوکھے پتوں کی طرح آتش گیر ہو جاتے ہیں؛ ذرا سی چنگاری دکھا دیجیے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگیں گے۔ ایسے زمانہ میں خبریں اور افواہیں چنگاری کا کام کرتی ہیں۔ جو لوگ آگ لگانا یا آگ کو ہوا دینا چاہتے ہیں وہ خبریں گھڑتے ہیں یا انھیں بہت بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں، یا بے بنیاد اور بے دھڑک افواہیں پھیلاتے رہتے ہیں۔ ہوشمندی اور سلامتی اسی میں ہے کہ افواہوں کو نہ باور کیا جائے، نہ انھیں آگے بڑھایا جائے۔

یہ وقت ذمہ داری کے تعین یا الزامات کے بٹوارے کا نہیں ہے؛ انھیں طے کرنے کے لیے بہت وقت پڑا ہے؛ یہ کام بعد میں ہوتا رہے گا۔ یہ وقت آگ بجھانے کا ہے، پھنکاریں مارتی ہوئی آگ سے جان و مال کو بچانے کا ہے۔ لیکن ہمیں اپنی اور اپنوں کی غلطی کا بھی احساس ہونا چاہیے۔ اکثریت کے ایک طبقہ کے تعصب اور عداوت کو بڑھانے، نشر کرنے اور پھیلانے میں خود اقلیت کے بعض نااندیش اور خود افزا رہنماؤں نے کوئی کم حصہ نہیں لیا۔ شیوسینا کی تحریک پر دلی میں آدم سینا بنانے چلنے کا اعلان کیا گیا۔ آدم سینا اس طرح بنی جیسے مصرع پر گرہ لگائی جاتی ہے۔ یعنی بنی و بنی خاک، نہیں، کاغذ کی زینت بن کے رہ گئی، لیکن شور ہندستان بھر میں مچ گیا کہ مسلمان لڑائی پر تل گیا ہے، اور اس کی تیاری زور و شور کے ساتھ کر رہا ہے۔ اس کے بعد دلی سے ایودھیا تک مارچ کرنے کے منصوبے بنائے گئے، جو حزم سے زیادہ خوف کے باعث آخری لمحے میں رد کر دئے گئے۔ منصوبوں اور

منسوخی نے برادرانِ وطن کو یہ سمجھا دیا کہ مسلمانوں کے عزائم کیا ہیں اور ان میں ہمت اور طاقت کتنی ہے۔ ساکھ بھی گئی اور عداوت بھی بڑھی۔ نااہل اور بر خود غلط قیادت اتنی مہنگی پڑ سکتی ہے، اس کا اُس وقت کسی کو گمان نہ تھا۔

لیکن مسلمانوں کی ناعاقبت اندیشی اور بعید از حقیقت لن ترانی سے انھیں اور ان کے وطنِ عزیز کو اتنا نقصان نہیں پہنچا جتنا حکومتِ وقت کی غلطیوں سے۔ اس قضیہ کو ۱۹۴۹ء میں عدالت کے حکم سے سر بہ مہر کر دیا گیا تھا اور عافیت اور سلامتی اور آشتی اسی میں تھی کہ وہ اسی طرح سر بہ مُہر رہتا۔ لیکن، جیسا کہ عام طور پر باور کیا جاتا ہے، مرکزی حکومت کے ایک شاطر اور شر پسند رُکن اور ریاستی حکومت کے سربراہ نے پسِ پردہ رہ کر، عدلیہ اور انتظامیہ کے ذریعہ قفل کیا کھلوایا، فتنہ و فساد کا دروازہ کھول دیا۔ بات شاید پھر بھی قابو میں رہتی لیکن شری لعل کرشن اڈوانی نے نہ جانے کیوں سومناتھ سے ایودھیا تک رتھ یاترا کا منصوبہ بنا لیا، اور تاریخ سے "قبل تاریخ" کی طرف سفر شروع کر دیا۔ انداز وہی اشوامیدھ یگیہ کی طرح جارحانہ اور فتحمندانہ تھا، کہ اگر کسی میں سکت ہو تو اسے روک لے، ورنہ سرِ تسلیم خم کر دے۔ سیدھی سی بات تھی کہ حکومت اس قسم کی رتھ یاترا کو جو شعلہ خیز، خون آمیز اور فتنہ انگیز تھی، سختی اور طاقت کے ساتھ روک دیتی، لیکن وہ گومگو اور لیت و لعل میں پڑ گئی۔ انتہائی نااہلی کے ساتھ اس نے رتھ یاترا کو آگے بڑھنے، آگ لگانے اور زور پکڑنے کی کھُلی چھوٹ دے دی۔ اس مجرمانہ غلطی کا ارتکاب اس لئے کیا گیا کہ اقلیتی حکومت کو اصولوں، قدروں اور بے گناہوں کی حفاظت کی بہ نسبت اپنی بقا زیادہ عزیز تھی۔ اگر کسی ضلع مجسٹریٹ سے ایسی حرکت سرزد ہوتی اور وہ آگ کو اس طرح ہوا سے باتیں کرنے اور زور پکڑنے دیتا تو وہ سولی پر ٹانگ دیا جاتا یعنی اس کا مستقبل خاکستر ہو جاتا۔ لیکن ہماری حکومت کو اپنی مجرمانہ غفلت اور نااہلی کا احساس بھی نہ ہوا۔ حکومت کا پہلا اور سب سے اہم فرض اپنے شہریوں کی جان مال اور آبرو کی حفاظت کرنا ہے۔ ہماری حکومت اپنی جان بچانے اور اپنی حفاظت کرنے میں لگی رہی۔ اس لحاظ سے یہ حکومت، جو بڑی امیدوں کے ساتھ گدی پر بٹھائی گئی تھی، اپنی پیشرو سے کچھ بہتر ثابت نہیں ہوئی، جس نے مذکورہ جھگڑوں میں دو طرفہ فریب دہی کو اپنا طریقِ کار بنا لیا تھا، یہ اور بات ہے کہ یہ بھٹکتے رہنے کے بعد بالآخر راہ راست پر آ گئی۔ لیکن اگر ارون شوری کو باور کیا جائے تو فریب دینے کی رسم راجیو گاندھی پر ختم نہیں ہوئی۔

اُدھر مسلمانوں کی انتہا پسند قیادت نے یہ نہیں سوچا کہ مسلمانوں کی فلاح ہندوؤں کے ساتھ مل کر رہنے میں ہے، اس وقت بھی جب کثرتِ تعداد کا گھمنڈ ان کے توازن اور صلح خواہی پر اثر انداز ہو رہا ہو۔ مل کر رہنے کا انداز کسی غیور جماعت کے لیے یہی ہو سکتا تھا کہ مشترک مسائل میں ہم شریکِ کار اور ملک کی ترقی اور انسانوں کی فلاح کے پروگراموں میں ہم ایک دوسرے کے معاون اور مددگار ہوں گے، جہاں تک کہ مذہب اور ثقافت اور روایات کا تعلق ہے، ہم اپنی اپنی راہ چلیں گے، آزادی اور سرفرازی کے ساتھ۔ لیکن ہوا کیا؟

الگ الگ اور دور دور رہنے کو بڑھاوا دیا گیا۔ جواباً یا دفاعاً شعلہ بار تقریریں بھی کی گئیں جن کا کوئی تعلق حقیقت حال سے نہ تھا۔ کاش ہمارے رہنما کھوکھلا جوش دلانے کی جگہ، تعلیم و تربیت، نظم، حفاظت اور تنظیم پر زور دیتے تاکہ مسلمان کمزور اور پسماندہ رہنے اور ہدف ناوکِ بیداد بننے کے بجائے، ترقی یافتہ، محفوظ اور مضبوط بن سکتے۔

یہ حسرت بھی ہر منصف مزاج ہندستانی کے دل میں کروٹیں لیتی ہے کہ کاش اکثریت کو یہ احساس ہوتا کہ مخلوط آبادی والے ملک میں جمہوریت کی کسوٹی صرف ایک ہے: اقلیت کا اطمینان، اس کی سلامتی اور اس کے ساتھ انصاف۔ کیا انھوں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ اگر اقلیت عاجز آگئی اور عرصۂ حیات اپنے اوپر تنگ محسوس کرنے لگی اور انصاف اور سلامتی اور دادرسی کی طرف سے مایوس ہوگئی، تو وہ ملک کے امن و امان اور وکاس اور ترقی کے لیے سب سے بڑا اور کبھی نہ مٹنے والا خطرہ بن جائے گی۔ اور پھر وطنِ عزیز کو آگے بڑھانے کی سب کوششیں اکارت جائیں گی۔ یہ سامنے کی موٹی سی، بدیہی بات ہے۔ حیرت ہے کہ ہمارے بہت سے برادرانِ وطن، ذہنِ ہندی رکھنے کے باوصف، اسے دیکھ نہیں پا رہے ہیں۔

ہماری مرکزی حکومت نے ڈھلمل یقینی، تامّل، تذبذب اور تاخیر کا امن سوز شیوہ اختیار کیا اور فرقہ وارانہ آہنگی اور بیر کو اس حد تک بڑھنے دیا کہ وہ قابو کے باہر ہوگیا۔ اس کی آنکھیں اس وقت کھلیں جب پانی سر سے اوپر ہوگیا تھا۔ یہ بات بھی کوئی ڈھکی چھپی نہیں کہ پولیس اور بعض نیم عسکری تنظیموں میں اقلیت مخالف جذبات سرایت کیے ہوئے ہیں۔ پولیس اور پی اے سی نے، خصوصاً پی اے سی کی بعض رجمنٹوں نے، فرقہ وارانہ فسادات کے دوران بارہا مسلم دشمنی کے ثبوت فراہم کیے ہیں۔ مسلمانوں کو اس حقیقت کو بھی اپنے حسابات میں شامل کرنا چاہیے تھا، لیکن حساب میں تو وہ صدیوں سے کمزور چلے آرہے ہیں۔

وہ تو بہار اور یوپی، خصوصاً یوپی، میں دو مضبوط اور منصف مزاج آدمی یعنی یادو ئین اقتدار میں آگئے، ورنہ اڈوانی جی کی رتھ یاترا اور زیادہ لہو بہا کر دم لیتی، دم تو اس نے ابھی تک لیا بھی نہیں ہے۔ کارسیوا جس کی تکرار سے ملک میں امن و امان پارہ پارہ ہو رہا ہے، اسی یاترا کا خوں ریز تتمہ ہے اور یہ سب کچھ شری رام چندر جی کے نام پر جن کے رام راج کی قسم کھائی جاتی ہے، ان کے انویائیوں کی طرف سے ہو رہا ہے۔ خیر۔ آخر آخر مرکزی حکومت نے جو جھرجھری لی اور مضبوطی کا اظہار کیا وہ سب یوپی کے وزیرِ اعلا کی توانائی اور صلابت کا پر تو تھا۔

ہمیں اس سے بحث نہیں کرنی چاہیے کہ آیا ۳۰ اکتوبر کو کارسیوا ہوئی (اب تو ثابت ہوتا جا رہا ہے کہ ہوئی)، یا بابری مسجد کو جراحت پہنچائی گئی، یا کارسیوک مسجد تک پہنچے کیونکر، یا بعض پولیس والوں نے کارسیوکوں کو پھول مالائیں ارپن کیں، یا پولیس کی گولیوں سے ایودھیا میں

مرنے والوں کی تعداد وہی ہے جس کا حکومت نے اعلان کیا، یا اس سے زیادہ، کہیں زیادہ؟ ان میں ساری باتیں سوائے ایک کے (جس کا ذکر آگے آئے گا) فروعی ہیں اور مسئلہ کے حل سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ بنیادی بات یہ ہے کہ اتر پردیش کی حکومت نے مرکزی حکومت کی مدد سے مسلمانوں کی عبادت گاہ کو مسمار کئے جانے سے بچا لیا، یہ کام بہت مشکل تھا خصوصاً جب کہ پولیس اور نیم فوجی دستوں میں بہت سے افراد کی ہمدردیاں رتھ یاتریوں اور کار سیوکوں کے ساتھ تھیں۔ ۳۰/ اکتوبر کو ملائم سنگھ یادو کے ہاتھوں ایک بار پھر یہ بات ایابۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ ہندستان ایک سیکولر اور جمہوری ملک ہے، دوسری طرف اڈوانی جی کی رتھ یاترا اور بابری مسجد کو توڑنے کی کار سیکوں کی کوشش نے یہ بتا دیا کہ ہماری اکثریت کو سیکولر مزاج راس نہیں آرہا ہے۔

بی جے پی اور وشو ہندو پریشد نے کار سیوا کے پروگرام کو ہنوز واپس نہیں لیا ہے۔ بابری مسجد پر کار سیوکوں کی یلغاریں جاری ہیں۔ ہمارے بہت سے بھائیوں کی بیش قیمت جانیں ایودھیا میں پولیس کی گولیوں سے ضائع ہوئیں۔ ہمیں اس کا صدمہ ہے۔ ہماری طرح وہ بھی جیتے جاگتے سانس لیتے ہوئے، گھربار والے انسان تھے۔ غلط رہنمائی اور مذہبی جنون نے انھیں قانون اور کروڑوں دلوں کو توڑنے پر کمر بستہ کر دیا تھا۔ بدلے کے طور پر ہندستان کے طول و عرض میں، بہت سے شہروں اور دیہات میں جو بے گناہ اور ناکردہ خطا لوگ تہ تیغ کر دیے گئے ان کا کوئی شمار نہیں۔ کوئی پوچھے تو کہ آخر ان کا کیا قصور تھا! بے گناہوں سے بدلہ؟ ان کی ناوقت اور ناکردہ گناہ موتیں بھی ہم ہندستانیوں کے سروں کو شرم سے جھکا دینے کے لئے کافی ہیں۔ شیلا پوجن، رام جیوتی اور رتھ یاترا نے فرقہ وارانہ فساد کی کتاب میں ایک تاریک باب کا اور اضافہ کر دیا۔ ان فسادات اور ان فرقہ وارانہ عداوتوں کو جو شہروں تک محدود تھی دیہات تک پہنچا دیا، ہندستان کے گوشہ گوشہ میں۔

ایسے نازک وقت میں مسلمانوں کو کرنا کیا چاہیے۔ یہ غنیمت ہے کہ ابھی تک، اپنی عام روش سے ہٹ کر ہماری انتہا پسند قیادت نے سنجیدگی اور ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے اور ہمارے عوام نے ضبط اور تنظم کا۔ ان کو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ قوموں کی زندگی میں ایسے وقت اور ایسے موڑ بھی آتے ہیں، جب شجاعت لڑتے میں نہیں ضبط کرتے میں ہوتی ہے، یورش کرتے میں نہیں مضبوطی اور پامردی کے ساتھ قدم جماتے میں ہوتی ہے۔ ہمیں اس وقت یہی کرنا چاہیے، اپنی روش پر قائم رہنا چاہیے۔ طرح طرح سے اشتعال دلایا جائے گا، ہمیں اس کی روک تھام کرنی ہوگی۔ ہمیں ثابت کرنا ہے کہ ہم آتش بازی کا انار نہیں کہ چنگاری لگتے ہی اپنی ساری توانائیاں فضا میں بکھیر دیں تاکہ آگ لگانے والے اور تماشہ دیکھنے والے تالیاں بجائیں، ہم ثابت کریں گے کہ ہم بھاری بھرکم، حلیم الطبع، تہ دار، مستقل بالذات، باشعور انسان ہیں، جو اپنے نفع نقصان کو سمجھتے ہیں، جنھیں اپنے عزم

اور اپنی جگہ سے ہٹا دینا آسان نہیں ہے، اور جو سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح مضبوط بن جانے کے امکانات رکھتے ہیں۔ یہ بات گھر گھر پہنچ جانی چاہیے۔

دوسرا کام جو ہمیں کرنا چاہیے وہ ایسی خراب صورتِ حالات کے باوجود ہندوؤں سے ہر سطح پر رابطہ قائم کرنا ہے، انھیں سمجھانا ہے کہ ہم سب کی بھلائی اور ہندستان کی خوشحالی اور ترقی ہندو مسلمان کے مل جل کر پیار محبت کے ساتھ رہنے میں ہے۔ ہمیں بہرحال اچھے شہری اور بھلے پڑوسی ہونے کا ثبوت دینا ہوگا۔ ہمیں اپنے اہلِ وطن کے دل جیتنے چاہئیں۔ آپ مسکراتے کیوں ہیں، کوشش کرنے میں کیا حرج ہے؟

تیسرا کام یہ ہے کہ ہم دوسری اقلیتوں اور پچھڑے ہوئے طبقوں اور درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں سے اپنے تعلقات مضبوط کریں۔ اور دن بدن زیادہ مضبوط کرتے چلے جائیں۔ ہندو مسلم تعلقات کی عمارت اس وقت کج اٹھائی گئی جب مسلمانوں نے جس کے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے فقر کو سرمایۂ فخر قرار دیا تھا، ہندستان آکر فقر سے روگردانی کی اور دولت اور امارت سے رشتہ جوڑ لیا۔ وہ دین جس نے غریبوں اور تنگدستوں کو ایک عالمگیر اخلاقی اور سماجی انقلاب کے ذریعہ سرافراز اور سربلند کر دیا تھا، اس کے نام لیوا ہندستان میں دولت اور ذات پات اور اثر و اقتدار کے دام میں گرفتار ہو گئے اور انھوں نے اپنا الحاق اعلا ذاتوں کے ساتھ کر لیا، حتیٰ کہ انھوں نے اللہ کے ان بندوں کو جنھیں نیچی ذاتیں کہا جاتا تھا حقارت سے دیکھنا شروع کر دیا۔ مسلمانوں کے لیے اس سے بڑی بدنصیبی اور نامرادی کیا ہو سکتی ہے کہ وہ اسلام کے اساسی اور انقلاب انگیز اصول، مساوات سے منحرف ہو جائیں۔ دین کی تعلیم سے اس کھلے ہوئے انحراف کا نتیجہ ہم آج تک بھگت رہے ہیں۔ ہمیں اپنے اس ملی اور تاریخی گناہ سے توبہ کرنی چاہیے اور اللہ کی غریب اور کمزور اور پچھڑی ہوئی مخلوق کی دستگیری کو اپنا دینی اور انسانی فرض سمجھنا چاہیے۔ آپ نے دیکھا نہیں، بہار اور اتر پردیش میں ایک پسماندہ ذات کے وزرائے اعلا نے انصاف کا جھنڈا اور انتظام کا دبدبہ اس وقت بلند رکھا جب کہ وہ ملک میں جابجا گرچکا تھا۔ ہمیں خود بھی اٹھنا ہے اور ہندستان کے دوسرے کمزور اور پسماندہ گروہوں کو بھی اپنے ساتھ اوپر اٹھانا ہے۔ ہماری اور ہندستان کی نجات اسی میں ہے۔ استحصال اور ناانصافی سے بچنے اور ان کی مدافعت کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ اگر ایک پسماندہ ملت دوسرے پسماندہ طبقوں سے بغلگیر ہو جائے تو اس میں اعتراض کا پہلو اور انوکھی بات کیا ہے؟ صورتِ حال کی منطق کا تقاضہ یہی ہے۔ اس ملاپ میں برکتیں ہی برکتیں ہیں، جن کے چہرہ سے آگے چل کر لیل و نہار خود نقاب اٹھا دیں گے۔

چوتھا کام، جسے انجام دے کر ہم اپنی اور حکومت اور معاشرہ سب کی مدد کریں گے، نظم و ضبط کا تنظیمی اور دفاعی پہلو ہے۔ اشتعال کا درجۂ حرارت خواہ کتنا ہی تیز کر دیا جائے ہمیں مشتعل ہو کر یا حملہ کر کے بدخواہوں کے دام میں خود کو پھنسانا نہیں چاہیے۔ البتہ جب

فضا ہر طرف خراب ہو رہی ہو اور اچھے بھلے آدمیوں پر جنون کے دورے پڑ رہے ہوں، اس وقت اپنی حفاظت کی جو بھی تدبیر بن آئے نہ کرنا خود کشی کے برابر ہوگا۔ ہمیں بہر حال چوکس اور ہشیار رہنا ہے، آہٹوں پر کان رکھنا ہے تاکہ حملہ آور ہجوم بے روک ٹوک گھستا ہوا نہ چلا آئے۔ کندھے اور ہتھیار ڈال دینے کے بجائے حملہ آوروں کو جم کر روکنے اور پیچھے دھکیلنے کے جتن کرنے چاہئیں۔ پولیس کو خطرہ کے امکان اور وقوع دونوں سے مطلع کر دینا چاہیے، اور ملک وملت کے رہنماؤں اور اخباروں کے نامہ نگاروں کو بھی، بے کم وکاست، بے مبالغہ، واغراق سچی اور مصدقہ بات میں وزن ہوتا ہے اور ساکھ بھی اُسی سے بنتی ہے۔ اپنی جان اور مال کی حفاظت ہر شہری کا قانونی حق ہے، جس کی بجا آوری پر کوئی اعتراض نہیں کر سکتا۔ بے خبر پکڑے جانے اور گاجر مولی کی طرح کٹنے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ انسان اپنے جان و مال اپنے شہری اور انسانی حقوق اور اپنی دینی روایتوں کی حفاظت کے لیے لڑتے ہوئے اپنے گھر میں یا اس کے دروازہ پر شہید ہو۔ یاد رکھئے کہ جو لوگ پیٹ کے ہلکے ہوتے ہیں اور زبان کے دراز سماج میں ان کا کوئی وزن، کوئی افادیت نہیں ہوتی۔ تنظیم کو خاموشی اور سنجم درکار ہوتے ہیں اور حفاظت کے حق کو یہ احتیاط کہ حدود سے تجاوز نہ ہو اور حفاظت حملہ میں نہ بدل جائے۔ یہ ساری باتیں مقامی طور پر صورت حالات کو دیکھتے ہوئے طے کرنی چاہییں۔ ہمارا مقصود بہر حال امن وآشتی اور طریقِ کار مفاہمت اور خیر اندیشی ہے۔

اگر آپ ایسے محلّہ میں رہتے ہیں جہاں آبادی مشترک اور مخلوط ہے اور آپ کی اکثریت ہے تو آپ پر واجب ہے کہ فرقہ وارانہ فساد کے دوران اپنے غیر مسلم ہمسایوں کو ان کی سلامتی کی طرف سے مطمئن اور بیکسو کر دیں اور آڑے وقت میں ان کی حفاظت کریں۔ ضرورت پڑے تو جان پر کھیل کر انھیں اپنے گھر میں پناہ دیں۔ آپ دوسروں کو بچائیں گے، خدا آپ کی حفاظت کرے گا۔ لڑائی آپ کی ہندوؤں سے نہیں ہے، وہ آپ کے بھائی ہیں لڑنا تو جرم، جنون، درندگی اور ناانصافی کے ساتھ ہے۔ لڑائی ہنسا اور خونریزی اور حیوانیت کے خلاف ہے۔ لڑائی ان لوگوں سے ہے جو خیر کو شر کے لیے استعمال کرتے ہیں، جو مذہب کو ظلم اور جہل کا آلہ کار بناتے ہیں۔ جو خود کو دھوکا دے چکے ہیں اور دنیا کو دھوکا دینا چاہتے ہیں، جو اُن ساری قدروں کو جنھیں انسانیت نے اوائل آفرینش سے پروان چڑھایا ہے منہدم کرنے پر تُلے ہوتے ہیں، جو دھرم کے روئے تاباں پر کلنک ہیں۔ ظلم وجہل سے لڑنے کے لیے طاقت درکار ہے۔ یاد رکھئے جُرمِ ضعیفی سے بڑا کوئی جرم نہیں ہے؛ اس کا ارتکاب کرنا گویا دین اور دنیا دونوں کو خراب کرنا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کارسیوکوں کے ایک بڑے گروہ سے رکاوٹوں اور حصاروں کو پھلنگوا دینے میں پولیس کے کچھ ادھیکاریوں کا ہاتھ تھا۔ کسی فورس کے لیے اپنے فرض اور حلف کی خلاف ورزی کرنا شرمناک بات ہے لیکن اس مذہبی جنون کو کیا کیجیے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ پی اے سی کی روایتی زیادتیوں کی جڑیں دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ہمیں اپنی تنظیم اور دفاع کی تیاری میں اس بات کو بھی خاطر نشاں

رکھنا چاہیے۔ اس بگڑی ہوئی صورتِ حالات کا:

(۱) ایک علاج مسلمانوں کی پولیس اور متعلقہ فورسوں میں معقول تعداد میں بھرتی ہے۔ ان میں بھرتی ہو کر ہمارے نوجوان امن وامان کی حفاظت کر سکیں گے اور اس طرح قومی یکجہتی کا مؤثر اظہار سرکار کے سب سے نمایاں بازو میں ہونے لگے گا۔ اس وقت شکل یہ ہے کہ مسلمان جن میں آسائش طلبی اور خانہ نشینی کے رجحانات کچھ زیادہ ہی بڑھ گئے ہیں، فورس کا رنگ وروپ اور اس کی مشقتیں دیکھ کر اس میں داخلہ کی طرف اپنی طبیعت کو آسانی سے نہیں لا پا رہے ہیں، کچھ اس خیال سے ٹھٹھک جاتے ہیں کہ اس فضا میں ہمیں کون لے گا؛ اور جو ہمت کر کے اور سینہ پھُلا کر لائن میں لگتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کو یہ لطافت الحیل چھانٹ دیا جاتا ہے۔ ہمیں ان رجحانات کا مقابلہ کرنا چاہیے اور ان کے خلاف رائے عامہ تیار کرنی چاہیے۔ پولیس اور نیم عسکری فورس میں اگر مسلمان قابلِ لحاظ تعداد میں شامل ہو گئے تو ان کے اکثریتی رفیقوں کی بہت سی غلط فہمیاں دُور ہو جائیں گی، ان کے دل پگھلیں گے۔ مسلمان نوجوانوں کو چاہیے کہ قومی یکجہتی اور امن وامان کی برقراری اور عام شہریوں کی حفاظت کی خاطر پولیس اور متعلقہ فورسوں میں داخلے کے لیے تیاری کریں اور عرضیاں گزاریں۔ وہ نوجوان جو پولیس میں جانے سے جی چراتے ہیں اور گھر چھوڑنے سے الکساتے ہیں، بالآخر ان ہی سے گھر چھڑوانا بہت آسان ہو جائے گا اور وہ بھی سدا کے لیے۔

تصویر کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ شری مرارجی ڈیسائی جیسے کھرے وزیراعظم نے علی گڑھ کے فسادات کے بعد مشترک فورس کا اعلان وپیمان کیا تھا۔ اس وقت شاید کچھ خفیف سی کوششیں ہوئیں اور پھر اس پیمان کو بھی طاقِ نسیاں نے اپنی وسیع آغوش میں لے لیا۔

(۲) اس کا دوسرا علاج اپنے قول وفعل سے ہندوؤں کو یہ سمجھانا اور سمجھانا ہے کہ ہم اپنے علاوہ ان کے اور اپنے وطنِ عزیز کے خیرخواہ ہیں۔ ہم اپنے اعمال کے لیے اپنے ضمیر اور جمہور کو جواب دہ ہیں۔ ہم سے ان افعال کے لیے باز پرس کرنا یا کدورت رکھنا جو ہمارے بزرگوں سے منسوب کر دیے گئے یا سرزد ہوئے ہیں، صریح ناانصافی ہے، اس طرح تو ملک آگے بڑھنے اور مستقبل کو تسخیر کرنے کے بجائے ایسے ماضی کا اسیر ہو جائے گا۔ جس کے خدوخال دانستہ بگاڑ دیے گئے ہیں۔

بہر کیف مسلمان جان لیں کہ انھیں عزت اور سلامتی کے ساتھ اپنے وطنِ عزیز میں زندہ اور تابندہ رہنا ہے تو جسمانی، ذہنی، تنظیمی اور اخلاقی طور پر خود کو اُوپر اُٹھانا ہوگا، اپنے وطنی بھائیوں کو گلے لگانا ہوگا، اور ملک کی ہمہ جہت ترقی اور غریبوں، پسماندوں اور کمزوروں کی فلاح کے لیے ان کے ساتھ رشتۂ اتحاد بہت استوار کرنے کی متواتر کوششیں کرنی ہوں گی، چاہے حالات کتنے ہی ناسازگار کیوں نہ ہو جائیں، چاہے ان کی دوستانہ پیشکشوں اور پیش قدمیوں کو اعلاداتِ والوں کی طرف سے ٹھکرایا ہی کیوں نہ جائے، ہمارا موقف ہونا چاہیے سرافرازی کے ساتھ خیرخواہی اور صلح طلبی۔

ملک میں امن وامان اکثریت کے لیے ایک مثبت اور خوشگوار صورتِ حالات ہے، اقلیتوں کے لیے یہ جائز بحالی کا وسیلہ اور بقا کی ناگزیر شرط ہے۔

(۳/ نومبر ۱۹۹۰ء)

ایودھیا کے قضیہ پر نظرثانی کی ضرورت

ہم سب جانتے ہیں کہ فرقہ وارانہ آشتی اور ہم آہنگی کی فضا کو بابری مسجد رام جنم بھومی تنازعہ نے درہم برہم کر دیا ہے۔ امن کے نام کی کوئی شئے گوتم اور گاندھی کے دیش میں باقی نہیں رہی۔ ایسی صورت میں سب سے زیادہ نقصان اقلیت کا ہوتا ہے، پھر ملک کا اور اس کے بعد اکثریت کا کیونکہ وہ جیت کی خوشی میں دوررس اور دیرپا نقصانات کا اندازہ نہیں کر پاتی۔ دنگے اور بلوے ملک کی ترقی کی رفتار کو دھیما کر دیتے ہیں؛ اس تیز دور زمانہ میں رفتارِ ترقی کا دھیما ہونا اتنا ہی مہلک ہوتا ہے جتنا ترقی کا رک جانا کیونکہ جو ملک پیچھے رہ گیا وہ آگے نکل جانے والے ملکوں کو دوڑ کر پکڑ نہیں سکتا۔ یہ فاصلہ دن بدن بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہ بات ہر وقت دہرانے کے لائق ہے کہ ہم باوجود سائنس اور ٹکنولوجی اور پروجیکٹوں میں ترقی کے دنیا کے مفلس ترین لوگوں میں سے ہیں، اور تعلیم کی اگر بات کی جائے تو دنیا بھر کے جاہلوں اور ان پڑھوں کی آدھی تعداد ہمارے یہاں بستی ہے۔ ہماری فی کس آمدنی ہنوز تشویش ناک حد تک کم ہے۔ ہمیں جہالت اور غریبی کے علاوہ بیماری اور گندگی سے لوہا لینا ہے۔ جو ملک اس حالت میں ہو اس کے باشندوں سے یہ اُمید کی جاتی ہے کہ وہ سب کچھ بھول کر تعلیم اور تعمیر میں لگ جائیں گے اور اختلافات کو یا تو ختم کر دیں گے، یا انھیں آیندہ کے لیے اٹھا رکھیں گے، لیکن ہمارے یہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اُس کا اُلٹا ہے۔ ہم گڑے مردے اکھاڑتے ہیں اور اہنسا کا سبق بھول کر خونریزی میں لگ جاتے ہیں اور ہمارا طرزِ عمل یہ بتاتا ہے کہ امن وصلح کی باتوں کو بھول جاؤ اور جھگڑوں کے شعلوں کو ہوا دو۔

اسی طرزِ عمل کے تحت ہم نے رام جنم بھومی، بابری مسجد کے جھگڑے کو جو عدالت کے حکم سے دفن ہو چکا تھا کھود کر نکال لیا اور اسے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان عداوت اور نفرت کے بیج بونے کے لیے استعمال کیا۔ کیا ہم ماضی کے اسیر ہو کر رہ گئے ہیں۔ کیا حال اور مستقبل کا ہمارے اوپر کوئی حق نہیں ہے۔ کیا ہمیں کوئی ٹائم مشین مل گئی ہے جس کے ذریعہ ہم گذشتہ زمانہ میں جی رہے ہیں۔ کیا ہم یہ نہیں چاہتے کہ ملک میں امن وامان رہے؛ لوگ

غریبی اور جہالت کے جیات آشام چنگل سے نکل آئیں ؟ کیا ہم اپنے بچوں کی کامیابی کے خواب نہیں دیکھتے ؟ پھر کیا وجہ ہے کہ مسجد، مندر قضیہ کو اتنا طول دے دیا گیا ! اُسے اس قدر پھیلادیا گیا۔ اس میں نقصان ہندو کا ہے مسلمان کا ہے، سارے ہندستان کا ہے ہندستان کی بھلائی اس میں ہے کہ اس میں رہنے والے سب لوگ ترقی کریں، خوشحال رہیں، اور مطمئن ہوں کہ ان کے جان و مال کی حفاظت ریاست اور اس کے کرچاری کریں گے اور ان کے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔ اگر کسی فرقہ یا جماعت کو یہ محسوس ہونے لگا کہ اب انصاف کی کوئی امید باقی نہیں رہی اور اکثریت حکومت کی شہ پاکر اس کے درپے آزاد ہوگئی ہے، تو وہ تنگ آکر جنگ پر آمادہ ہوجائے گا اور جس بدامنی اور بدقسمتی میں پنجاب، کشمیر اور اترپوربی ہندستان گھرا ہوا ہے وہ ہندستان میں گھر گھر پھیل جائے گی۔ مسلمان بہت عرصے سے فرقہ وارانہ فسادات کو برداشت کر رہے تھے، حالاں کہ انھیں روک دینا حکومت کے قبضۂ اختیار کی بات تھی۔ ایودھیا کے نزاع اور بھارتیہ جنتا پارٹی اور وشو ہندو پریشد کی رتھ یاترا نے ہر طرف آگ لگادی، ہر دشا میں خونریزی شروع ہوگئی۔ اگر ملک کی ترقی اور عافیت فرقہ وارانہ ہم آہنگی پر منحصر ہے۔ تو ملک اب ایک عرصہ کے لیے ترقی کی راہ سے کوسوں دور اور عافیت اور امن و سکون سے یکسر محروم ہوگیا ہے۔

جو مسلمان یا حکومت کے جو اعضا یہ سمجھ رہے ہیں کہ ملک کی سیاسی پارٹیوں میں بھاجپا ایک ہے اور باقی ساری پارٹیاں اس قضیہ میں مسلمانوں کے ساتھ ہیں اور متنازعہ جگہ پر کارسیوا کے خلاف ہیں اور مسجد کے توڑنے یا اسے مندر کے حصار میں لانے کو غلط یا بُرا سمجھتی ہیں۔ انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ باوجود مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی کے ان پارٹیوں میں اتنا دم نہیں تھا کہ وہ آگے بڑھ کر عوامی سطح پر رتھ یاترا کی سدِ راہ ہوتیں اسے روکتیں۔ وجہ ظاہر ہے پریشد اور بھاجپا نے اپنی مسلمان مخالف مہم کے لیے ایک ایسا نام چُنا تھا جس سے ہر ہندو کو بے انتہا عقیدت اور زبردست جذباتی لگاؤ ہے۔ شری رام چندر جی کے ایثار و کردار کا خود مسلمان بھی بہت احترام کرتے ہیں۔ یہ ایک طرح تاریخ کا طنز ہے کہ جو بڑی اور منفرد ہستی ایسے راج کے لیے مشہور ہے جس میں شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے ہوں اس کے مبارک نام کو بعض شدت پسندوں نے کشت و خون اور عداوت اور کدورت کا نقطۂ آغاز بنا لیا۔ یہ تو جملۂ معترضہ تھا، کہنا ہم یہ چاہ رہے تھے کہ ہمیں ہمدردی کا اظہار کرنے والی سیاسی پارٹیوں یا دانشوروں کے بیانات سے مطمئن نہ ہونا چاہیے۔ ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ سیاسی پارٹیاں اور ان کے رہنما بسا اوقات عوام کے جذبات کی صحیح ترجمانی نہیں کرپاتے موجودہ مرکزی حکومت سے پہلے کی دونوں حکومتوں کا نقطۂ نظر جہاں تک ایودھیا اور مسلمانوں کا تعلق ہے، اپنے سیاسی مصالح، لیت و لعل اور مکر و فریب پر مبنی تھا۔ ہمیں شری راجیو گاندھی اور شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ کی "زود پشیمانی" کے دھوکے میں نہیں آنا چاہیے۔ سیاسی رہنما صرف ایک صنم کی پوجا کرتے ہیں، وہ ہے اپنی بقا اور اقتدار کی طلب

کیا عجب کہ موجودہ مرکزی حکومت کا اندازِ فکر وہی ہو جو اس کے پیش رووں کا تھا۔ مراد اس سے موجودہ حکومت کی تنقیص نہیں ہے۔ اسے ہمیں موقع دینا چاہیے تاکہ ہم اسے آزما سکیں اور دیکھ سکیں کہ وہ سچائی اور انصاف سے کتنے قریب یا کتنی دور ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ عوام کی یا جنتا کی رائے کیا ہے۔ اس مسئلے میں ہندوؤں کے جذبات کیا ہیں۔ ملک کی بدقسمتی سے ہم اس وقت اس موڑ پر ہیں جہاں ہندو عوام انتہا پسندوں کے ساتھ ہیں، انھیں مسلمانوں سے بہت سی شکایتیں ہیں کچھ حقیقت پر مبنی، کچھ فرضی، کچھ افواہوں کی پروردہ۔ ان کی سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ مسلمانوں نے ان کے بھگوان رام چندر جی کی جائے ولادت پر صدیوں سے قبضہ کر رکھا ہے اور اسے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہے

ہمیں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہیے کہ شری رام چندر جی کی جنم بھومی بعینہٖ یہی جگہ ہے جہاں بابری مسجد بنی ہوئی ہے یا اس نواح میں کوئی دوسری جگہ۔ اس بات پر زور دینا بھی لایعنی ہوگا کہ ایودھیا میں بہت سے مندر اس شرف کا دعوا کرتے رہے ہیں۔ اس دلیل کو بھی وزن نہ دیجیے کہ شری رام چندر جی کا وجود جیسا کہ کئی ہندو مورخ کہہ چکے ہیں قبل تاریخ سے تعلق رکھتا ہے، اس لیے ان کی پیدائش کی جگہ اور تاریخ دونوں کا تعین ممکن نہیں۔ یہ کہنا بھی چنداں سود مند نہ ہوگا کہ بابر کا مزاج افتادِ طبع اور رویہ محمود غزنوی سے بالکل مختلف تھا اس کا مقصد لوٹ مار نہیں تھا، اس نے ہندستان کو ایک مضبوط حکومت دی جس نے ملک کی ثقافت کو چار چاند لگا دیے، اس سے یہ بات منسوب نہیں کی جا سکتی کہ اس نے مندر توڑا ہوگا اور مندر بھی وہ مندر جو شری رام چندر جی کی جنم بھومی پر بنا ہو۔ بنیادی حقیقت یہ ہے کہ ہمارے اہلِ وطن کی اکثریت اس وقت صمیمِ قلب سے یقین رکھتی ہے کہ بابری مسجد اس مندر کو توڑ کر بنائی گئی جو شری رام چندر جی کی جائے پیدائش پر کھڑا ہوا تھا۔

راقم سطور یہ سمجھتا ہے کہ ہمیں اس حقیقت کو تسلیم کرنا چاہیے۔ اور زیرِ نظر قضیہ کو اس کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ ہماری غفلت ہے کہ ہم نے اس مسئلہ کو اس وقت حل نہیں کیا جب عام ہندو اس کے وجود سے بے خبر تھا۔ اور جب کئی مندروں پر رام جنم بھومی کا گمان تھا۔ ہماری قیادت نے نزاع کی چنگاری کو اپنی ناعاقبت اندیشی اور طاقت کی بے جا اور بے محل نمائش سے بھڑکا دیا اور اب سارا ملک اس کی لپیٹ میں ہے۔ مسلمان اس سلسلہ میں غلطی پر غلطیوں کے انبار لگائے چلے جا رہے ہیں۔ رتھ یاترا سے پہلے بھی حالات اچھے نہیں تھے، لیکن اس کے بعد بہت بگڑ گئے ہیں۔ حالات کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباسات سے لگائیے۔ ۲۸ اکتوبر ۱۹۹۰ء کو راجیو سکسینہ نے کرنل گنج گونڈہ سے سنڈے آبزرور (۷ لغایۃ ۱۳ اکتوبر) کے نام اپنی رپورٹ میں لکھا:

"ضلع کی ہوا موت کی مہک سے بوجھل ہے! سرکاری ذرائع مرنے والوں کی تعداد ۳۷ بتا رہے ہیں لیکن غیر سرکاری تخمینوں کے مطابق یہ تعداد دو سو سے زیادہ ہوگی۔ یہ خونریزی بھاگلپور کے کشت و خون کی یاد دلاتی ہے۔ کم سے کم دو درجن گاؤں بلوے کے ہدف ہے۔

ہیں۔ ہمیشہ کی طرح نقصان بیشتر مسلمانوں کا ہوا ہے۔ جس وقت موت کی ورانتی انسانوں کی فصل کاٹ رہی تھی پولیس اور ضلع کی انتظامیہ خاموش کھڑی تماشہ دیکھ رہی تھی۔ کئی گاؤں صفحۂ ہستی سے مٹا دئے گئے۔ پانڈے پورا کے تقریباً تمام مسلمان خاندان تہ تیغ کر دئے گئے، صرف دو ایک آدمی اس بھیانک المیہ کی داستان سنانے کے لیے بچ گئے ہیں۔"

"گونڈہ ضلع میں اموات کی بڑھتی ہوئی تعداد اور بیک وقت کم سے کم چار دوسری ریاستوں میں فرقہ وارانہ فسادات (راجستھان، گجرات، مدھیہ پردیش، کرناٹکا) اس بات کے گواہ ہیں کہ ملک آتش فشاں پر بیٹھا ہوا ہے۔ ایک طرف بھاجپا اور وشو ہندو پریشد کی فرقہ وارانہ مہم نے وسیع پیمانے پر فساد کے لیے میدان تیار کر دیا ہے تو دوسری طرف جنتا دل نے مسلمان فرقہ پرست عناصر کو سینہ سے لگا کر فتیلہ کو چنگاری دکھانے کا سامان فراہم کر دیا ہے۔ کرنل گنج میں نعشیں کنوؤں، تالابوں اور کھیتوں سے نکالی جا رہی ہیں۔ "موراواں پُروا" کرنل گنج سے ۱۲ کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔ بیشتر گھر مسلمانوں کے ہیں جو درزی اور دستکار ہیں یا رسّی بناتے ہیں۔ ۳۰ ستمبر کو اس افواہ کے باعث کہ مسلمانوں نے کرنل گنج میں دُرگا وِسرجن جلوس پر حملہ کر دیا ہے، ان پر انتقاماً دھاوا بول دیا گیا۔ ۸ بجے رات تک ہزاروں آدمیوں نے اس چھوٹے سے مزرع کو گھیر لیا۔ چاندنی رات میں ان کے بھالے، کلہاڑیاں اور درانتیاں ہیبت انداز سے چمک رہی تھیں۔ مسلمان چھتوں پر چڑھ گئے۔ انھوں نے حملہ آوروں کو دور رکھنے کے لیے پتھر پھینکے لیکن ذرا سی دیر میں دشمن ان پر غالب آ گئے، انھوں نے چھے مکانوں کو جلا کر راکھ کر دیا۔ مسلمانوں نے کھیتوں میں پناہ لی۔ انھوں نے پولیس سے مدد مانگی۔ وہ یہ کہہ کر چلی گئی کہ ہم ابھی آتے ہیں، لیکن وہ آئی اس وقت جب موت اور آگ کا ننگا ناچ ختم ہو چکا تھا۔ دوسرے دن حملہ آور پھر آ گئے۔ مسلمانوں کے گھروں کو راکھ کے ڈھیر میں بدل ڈالا۔ اِدھر شعلے آسمان کو چاٹ رہے تھے، ادھر بلوائی مسلمانوں کو کاٹ رہے تھے۔ عداوت کو شہ لوٹ کی لالچ سے مل رہی تھی۔ (وہ اپنے پُرامن اور بے گناہ ہم وطنوں کو لوٹ رہے تھے اور قتل کر رہے تھے۔ مضمون نگار) جب حملہ آور اپنا کام ختم کر کے واپس گئے تو دس نعشیں خاک و خون میں پڑی ہوئی تھیں، زخمیوں کا تو کوئی شمار نہ تھا۔ جمیل درزی کے گھر میں نو آدمی تھے۔ ان میں سے آٹھ کا ماتم کرنے کے لیے وہ بچ گیا۔ اب وہ ٹھیک سے ماتم نہیں کر سکتا۔ وہ پاگل ہو گیا ہے۔ مارے جانے والوں میں بوڑھے ماں باپ کے علاوہ تین بیٹے اور ایک تین سال کی لڑکی تھی۔

یہی بھیانک داستان "کوپٹا" اور "پیری گاؤں" میں دہرائی گئی۔ "کنجامئو" میں بھی آگ افواہوں نے لگائی۔ ہندو نوجوانوں نے جوش و جنون میں مسلمان بنکروں کی بستی پر دھاوا کر دیا اور دو آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ بہتوں نے ماتا پرشاد پردھان کے گھر میں پناہ لی۔ حملہ آور ہجوم نے پردھان پر بہت دباؤ ڈالا کہ مسلمانوں کو ان کے حوالے کر دے لیکن اللہ کا وہ بندہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ دوسرے دن حملہ کی تحریک اس افواہ سے ہوئی کہ

جنتادل کے ایم پی منّن خاں کے پٹھان حملہ کرنے آ رہے ہیں۔ پھر کیا تھا بچے کھچے ہنکروں میں سے پانچ تہہ تیغ کر دیے گئے۔ فیاض کو جو اپاہج تھا بھالے سے ٹھکانے لگا دیا گیا اور اس کی نعش کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اسے بھون ڈالا گیا۔ یہی برتاؤ حشمت اور عبدالعزیز کے ساتھ ہوا۔ قتل اور آگ زنی کے اسی قسم کے واقعات شاہ پور مانجھا، دھنوا، ہردیال پوروا، چندوا، "کنج کستوری، رائے سالی پور" اور چار دیہوں میں ہوتے۔ اتنی فورس تھی ہی نہیں کہ ان مزرعوں اور دوسرے دور افتادہ پُروؤں میں گشت کر سکے۔ نِس پر اطلاع رسانی کے ذرائع صفر تھے۔ ایک سینئر پولس افسر نے مجھے رازدارانہ انداز میں بتایا کہ اگر فسادات دوسرے گاؤں میں پھیل جاتے ہیں تو پولس کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ ہوگا کہ خاموش بیٹھی دیکھتی رہے۔"

۲۷ اکتوبر کو نروپاسبرامنیم (آبزرور، ۲۸ اکتوبر بغایت ۳ نومبر ۱۹۹۰ء):

جے پور سے "جے پور کی خوں ریزی کی ان کہی کہانی" عنوان کے تحت لکھتی ہیں:

رام گنج کی گھنی آبادی کے درمیان محلہ کولیان اور رشی غالب نگر پر اچانک موت نے اپنے پنجے اس درندگی کے ساتھ بڑھائے جس کی کوئی مثال ملک کے اس حصہ نہیں ملتی۔ گلابی شہر کا رنگ بہ تدریج گہرا ہوتا چلا گیا حتیٰ کہ وہ سیاہی مائل سُرخ ہو گیا، لہو کا ہم رنگ، جس روز شری اڈوانی کی گرفتاری کے خلاف باندھ کا اہتمام کیا گیا اس دن سے اب تک ۴۷ موتیں ہوئی ہیں اور تین سو آدمی زخمی ہوتے۔ اب کرفیو سے ڈھکے ہوئے شہر میں موت کی سی خاموشی طاری ہے۔ رشی غالب نگر میں سترہ آدمی مارے گئے اور محلّہ کولیان میں بے جلی ہوئی نعشیں دریافت ہوئیں۔ دونوں محلوں کا اس وقت یہ نقشہ ہے جیسے وہاں آسیبوں اور بھوتوں کی حکمرانی ہو۔ جلا ہوا گوشت، جلتے ہوئے کپڑے، جلے ہوئے فرنیچر اور ربر کی (جو ابھی تک دھواں دے رہی ہے) بدبو ان دونوں بستیوں کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے (ایک میں غریب مسلمانوں کی نعشیں ہیں دوسرے جس غریب ہندوؤں کی) رشی غالب نگر میں چوکھٹ پر جو خون بہہ رہا ہے وہ گواہی دے رہا ہے کہ یہاں مقتول چاقو کا زخم کھا کر گرا ہوگا۔ زندگی کی واحد نشانی وہ بکریاں ہیں جنھیں اس بستی کے مکیں جان بچا کر بھاگتے ہوئے اپنے ساتھ نہ لے جا سکے۔ کتّوں کے بھونکنے کی غم ناک آواز اور پیڑوں پر بندروں کے بے ہنگم شور نے اس جگہ کو اور ڈراونا بنا دیا ہے۔"

"بھاجپا کے ریاستی صدر شری رام داس اگروال نے بتایا جاتا ہے یہ کہا تھا کہ ایک ہی ندی میں رہتے ہوئے مچھلی کو مگرمچھ سے لڑنے کے ڈول نہیں ڈالنے چاہئیں۔ یہاں کے وزیر اعلا نے شری اڈوانی کی رتھ یاترا کے ضمن میں مرکزی وزیر داخلہ مفتی محمد سعید کو چنوتی دی تھی کہ اڈوانی جی کو گرفتار کر کے دیکھیں۔ بھاجپا کے لگائے ہوئے باندھ کو جبراً نافذ کرانے کے لیے جب ہجوم رام گنج کی تنا ؤ بھری بستی میں گھسنے کی کوشش کر رہا

تھا تو دفعتاً وہاں گھروں سے پتھر پھینکے گئے۔ بالآخر پولیس کو گولی چلانی پڑی۔ پھر کیا تھا تشدد کو کھلی چھوٹ مل گئی اور وہ رام گنج سے تری پولیا بازار، وہاں سے کیشن پول اور چاند پول تک فراٹے بھرتی ہوئی آگ کی طرح پھیل گیا۔ آگ کی طرح بلکہ اس کے عقب اور جلو میں افواہیں بھی پھیلتی رہیں۔ دربار علی درزی ہسپتال میں بھرتی ہے۔ وہ بیچارہ شور سُن کر اپنے گھر کے ایک گوشہ میں چھپ گیا۔ نوجوانوں کی ایک ٹولی گھر میں گھس آئی۔ ذراسی دیر میں وزیر علی کی بیوی اور تینوں بچوں کو کاٹ ڈالا۔ ہر گھر قتل و غارت کا ہدف بنا۔ موٹر مستری حکیم بھائی کے دروازے پر خون کے نشان ہیں۔ ظاہر ہے کہ گھائل ہو کر غریب وہیں گرا ہوگا اور وہیں اس نے دم توڑا ہوگا۔ ایک جلی ہوئی گاڑی کی ٹکالک پر کسی نے انگلی سے "اوم" لکھ دیا تھا۔ پولیس اس خوں ریزی کے گھنٹوں بعد جائے واردات پر پہنچی جب کرنے کو صرف ایک کام رہ گیا تھا، مکانوں میں سے نعشوں کو نکالنا۔ باقی سارے کام قاتل کر چکے تھے۔ سینئر پولیس افسروں نے بتایا کہ سرکار کو خبر تھی کہ باندھ کے روز ہنگامہ ہوگا، شری اڈوانی کی رتھ یاترا کے بعد سے فضا بگڑی ہوئی تھی۔ پولیس نے بتایا کہ سارا فساد بھاجپا کی ان اشتعال انگیز تقریروں سے شروع ہوا جو باندھ سے ایک شام پہلے کی گئی تھیں۔

۳۰ نومبر کے قومی آواز میں مسٹر کے ایف رستم جی کے ایک مضمون کا وہ ترجمہ شائع ہوا ہے جو خلیل احمد خاں صاحب نے کیا ہے۔ عنوان ہے "ایودھیا کے واقعات اور مضمرات" اقتباسات قارئین کی نذر ہیں:

"ملک کے سیکڑوں ہزاروں مقامات پر اقلیتوں کی بڑی تعداد کو پناہ گاہیں نصیب نہیں ہوئیں۔ یہاں تک ہوا کہ وہ اپنے مرنے والے اعزہ کے جنازے لے کر انھیں دفن بھی نہیں کر سکے۔ وہ بھوکے رہے، تڑپتے رہے، دعائیں کرتے رہے اور التماس کرتے رہے اور ان لوگوں کو بددعائیں دیتے رہے جنھوں نے صرف اپنے مخصوص مفادات کے لیے انھیں برباد کیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا سڑک پر ہونے والی اس جنگ سے میلوں دور بیٹھے ہوئے لوگ یہ بتا سکتے ہیں کہ انھیں کیا کرنا چاہیے اور انھیں اس میدانِ جنگ سے باہر لا سکتے ہیں، جن کو انھوں نے میدانِ جنگ میں جھونک دیا تھا! یا خوش اسلوبی کے ساتھ انھیں اس جنگ سے باز رکھتے ہوئے ایک بہتر اور خوشگوار زمین ہموار کرنے کی راہ پر گامزن ہو سکتے ہیں۔

سیکولرزم کا مفہوم یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ایک طرف تو مسلمانوں کے تحفظ کا دعوا کیا جاتے اور دوسری طرف ان کی دینوی راحتوں کو تاراج کیا جائے۔ سیکولرزم کا مفہوم ہرگز ہرگز یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم اپنی نیک خواہشات کے ساتھ مسلمانوں کو اپنی عبادت گاہوں میں عبادت کرنے کی اجازت تو دے دیں اور دوسری طرف ان کو زندہ نہ رہنے دیا جائے۔ یہ ستم ظریفی نہیں تو کیا ہے کہ کسی کو سارے انسانی حقوق سے محروم کر دینے کے بعد بھی یہ دعوا کیا جائے کہ سیکولرزم کا تحفظ کیا جا رہا ہے۔ کیا صرف مساجد کا تحفظ ہی سیکولرزم ہے جب کہ سیکولرزم کی دوسری ساری بنیادوں کا استحصال کیا جا رہا ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس

خطرہ کا احساس ہی نہیں ہے جو ان کے سروں پر منڈلا رہا ہے۔ وہ اب بھی یہ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ ہندوؤں کی برہنہ شمشیریں ان کے سروں پر لٹک رہی ہیں۔ ان کی قیادت کا یہ حال ہے کہ ہر اس مفاہمت کی راہ میں رکاوٹ حائل کرتی ہے۔ جو ملک کی نوّے فیصد ہندو آبادی کو مطمئن کر سکے۔ ملک کی طاقتور اکثریت ہندو ہیں اور ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو اس اکثریت کے رحم وکرم پر انحصار کرنا ہے اور اب تک جس سیکولرزم کا نعرہ دیا جا رہا ہے، اس کی جڑیں کمزور ہو گئی ہیں۔ اب اگر مسلمانوں کی قیادت یہ سوچتی ہے کہ ان کی گیارہ فی صد ووٹوں کی طاقت انھیں سیاسی حیثیت سے ہمکنار کر دے گی تو یہ ان کی خام خیالی ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ان (سیکولر) پارٹیوں کے ہر تجزیہ سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ بھارتیہ جنتا پارٹی ہی کی ہمنوائی کر رہی ہیں۔ سب سے زیادہ اور ضروری بات ہے کہ مسلم قیادت کو یہ سوچنا چاہیے کہ ان کو بدلتی ہوئی صورتِ حالات کا مثبت جواب دینے اور مفاہمت کی راہ ہموار کرنے کے لیے کون سا صحیح راستہ اختیار کرنا ہوگا۔ مسلمانوں کی معیشت اور سماجی حیثیت مزید زوال پذیر ہوتی جا رہی ہے یہ بھی صحیح ہے کہ اگر مسلمانوں نے مفاہمت کر لی تو بھی تنازعات ختم نہیں ہوں گے اور ہو سکتا ہے کہ کوئی دوسرا فتنہ کھڑا کر لیا جائے۔ تاہم کم سے کم یہ تو ہوگا کہ گفت وشنید کے دروازے کھل جائیں گے اور وقت یہ سوچنے پر مجبور کر دے گا کہ ملک کی اکثریت سیکولرزم کے پرچم تلے آجائے۔"

اسی تاریخ کے قومی آواز میں طاہر انور صاحب کا ایک مراسلہ "علمائے دین سے گزارش" کے عنوان سے چھپا ہے جس میں انھوں نے رائے ظاہر کی ہے کہ "کسی بھی متنازعہ مسجد کی وجہ سے فتنہ وفساد ہونے اور انسانی جانیں ضائع ہونے کا خدشہ لاحق ہو تو اس سے دست بردار ہونا بھی کارِ ثواب ہے۔ انسان مسجد کو اینٹ اور گارے سے اپنے ہاتھ سے تعمیر کرتے ہیں اور انسانوں کو خدا پیدا کرتا ہے۔ انسانی جانوں کو ضائع ہونے سے بچانا علمائے دین کا فرض ہے۔ ملک میں سیکڑوں مسجدیں ایسی ہیں جن پر غیر مسلموں کا قبضہ ہے لیکن علمائے دین نے ان کی نجات کے لیے کوئی آواز نہیں اٹھائی۔ اگر ان کو یہ کہہ کر چھوڑا جائے کہ ان پر غیر مسلموں کا قبضہ ہے تو بابری مسجد میں بھی کافی عرصے سے نماز نہیں پڑھی گئی۔ آخر کب تک علمار دین بے گناہ انسانوں کو اس تنازعہ کی بھینٹ چڑھاتے رہیں گے۔"

اس قسم کے اور خطوط بھی "قومی آواز" میں شائع ہوتے رہے ہیں، جن میں ان فسادات کے مظلومین کی چیخ اور کراہ شامل ہے جو اس تنازعہ کے نتیجہ میں برباد کر دئے گئے۔ ہم نے اس مضمون کو طویل اقتباسات سے بوجھل اس لیے کیا ہے تاکہ ہمارے قارئین صورتِ حالات کی سنگینی سے واقف ہو جائیں۔ انھیں پتا چلے کہ فسادات میں غریب مسلمانوں پر کیا گزری۔ وہ جان جائیں کہ جس سیکولرزم اور سیکولر طاقتوں پر وہ تکیہ کئے ہوئے تھے وہ پتوں کی طرح ہوا دینے لگی ہیں۔ اس مسئلے بلکہ تمام ہندو مسلم بلووں میں ان سے کسی امداد کی امید نہیں۔ انھیں یہ بھی معلوم ہو جائے کہ قانون برقرار رکھنے والی فورس پر جو بھاجپا کی ملک گیر تحریک سے متاثر ہو گئی ہے، بھروسا نہیں کیا جا سکتا،

اور یہ کہ مسلم دشمنی کا زہر شہروں سے آگے بڑھ کر دیہات کے رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے اور دیہات میں لگنے والی فرقہ واریت کی آگ جنگل یا کوئلہ کی کھان کی آگ ہے، جس کو قابو میں کرنا تقریباً محال ہو جاتا ہے اور یہ بھی پتا چل جائے کہ مسلم عوام اب ہمارے علما اور رہبروں کی اس نیتی سے بیزاری ہونے لگے ہیں جو انھیں تختۂ مشق ستم بنوا دیتی ہے لیکن ان کی حفاظت اور سلامتی کی طرف دھیان بھی نہیں دیتی۔ رستم جی کے مترجمہ مضمون سے طویل اقتباس اس لیے دیا گیا ہے کہ رستم جی آزادی کے بعد ہندستان کے سب سے لائق اور کارگزار پولیس آفیسر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں اور ملک کی انتظامی حالت اور اس کے مستقبل کے امکانات پر ان کی گہری نظر ہے اور وہ مسلمانوں بلکہ سارے مظلوموں سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ دوسروں کے اقوال کو خیرباد کہنے سے پہلے ہم مولانا اخلاق حسین قاسمی صاحب کے اس مراسلہ کی طرف بھی اشارہ کریں گے جس میں انھوں نے "رخصت" کے اس اصول کا ذکر کیا ہے جو سورۂ نمل سے اخذ کیا گیا ہے اور جو غالباً خطرہ کی حالت میں ردّ عمل کے لیے شرعی وسعت پیدا کر دیتا ہے۔

راقم حروف کی نگاہ میں یہ بات غیر ذمہ داری اور بے حسی کی ہے کہ ہمارے رہنما اور علما خود تو میدان میں اترتے نہیں اور سیکڑوں ہزاروں مسلمانوں کی جان مال آبرو کو ضائع ہو جانے دیتے ہیں۔ بات تو جب تھی کہ اگر مسلمانوں کو ہدفِ ستم بننا تھا تو سب سے پہلے یہ خود بنتے۔ کیا انھیں اندازہ نہیں کہ بابری مسجد کے تنازعے نے ہندستان کے بیشتر مسلمانوں کی جان کو سولی پر لٹکا دیا ہے۔ ان کی صلاحیتوں کو گھائل اور ان کے حوصلوں کو پست کر دیا ہے۔ اس نے مسلمانوں کو پچاس برس پیچھے دھکیل دیا ہے۔ اب وہ پھر سے اُکھڑ گئے ہیں۔ ان کا دل نہ تعلیم میں لگتا ہے، نہ صنعت میں نہ تجارت میں۔ اور آخر الذکر دونوں میں ان کا راستہ بڑھتی ہوئی نفرت اور عداوت کی وجہ سے دشوار گزار ہو گیا ہے۔ ان پر ہندستان میں عزت اور عافیت کے ساتھ جینا دوبھر ہو گیا ہے۔ سیاسی پارٹیاں کچھ بھی کہتی رہیں اور تت نئے فریب اور تسلیاں دیتی رہیں۔ حقیقت حال یہ ہے کہ مسلمانوں کے خلاف ایک زبردست لہر غصے، غرور اور عداوت کی سر اُٹھا رہی ہے۔ جو مسلمانوں کو ڈبونے پر تلی ہوئی ہے۔ راقم حروف تصور کرتا ہے کہ جو رُخ آج مسلمانوں کے مذہبی اور سیاسی رہنما اختیار کر رہے ہیں اگر اوائل اسلام میں اختیار کیا جاتا تو اسلام وہیں گھٹ کر رہ جاتا۔ کروروں بندگان خدا کی عزت آبرو اور زندگی کو ایک پلّہ میں رکھئے اور دوسرے میں ایک مسجد کو جس میں چالیس سال سے نماز نہیں ہوئی، جس کے قریب مسلمانوں کی اگر آبادی ہے بھی تو برائے نام اور جس میں بُت رکھے ہوئے ہیں جنھیں ہٹانے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ بھی نہیں۔ پھر فیصلہ کیجیے کہ کون زیادہ اہم ہے۔ ہمیں موقف وہی اختیار کرنا چاہیے جس کے ذریعہ ہم مسلمانوں کی جانوں اور ان کے عزائم اور حوصلوں اور نتیجتاً ان کے دین کی حفاظت کر سکیں۔ یہ بھی نہ بھولئے کہ بھولئے کہ موجودہ رہنماؤں اور علما کا اثر تیزی سے کم ہو رہا ہے۔ زخم خوردہ اور عافیت سے محروم مسلمان روز روز کے مصائب سے تنگ آ گئے ہیں۔ اگر ان کی آنکھ اب بھی نہ کھلی اور وہ بابری مسجد کی بازیابی پر اڑے رہے تو بابری مسجد تو ملنے سے رہی نہ معلوم ملک

پھر میں کتنی مسجدیں شہید ہو جائیں گی اور کتنی جانیں تلف ہو جائیں گی۔ بابری مسجد کو بچانے کا فیصلہ کرنے کا آپ کو حق جب ہی ہے جب آپ ان کروروں مسلمانوں کے دین ایمان اور جان اور مال کو بچا سکیں جنھیں آپ نے اس کے نتیجہ میں داؤ پر لگا دیا ہے۔

موجودہ شکل میں ہمارا مفاد اسی میں ہے کہ ہم بی جے پی اور وشو ہندو پریشد کے رہنماؤں سے گفتگو کریں اور اس بات پر فیصلہ کریں کہ بابری مسجد کو احترام کے ساتھ (جیساکہ شری اڈوانی نے کہا تھا) ہٹا کر قریب ہی نصب کر دیا جائے اور یہ دونوں پارٹیاں اور بجرنگ دل اور چاروں محترم شنکر آچاریہ اس بات پر راضی ہو جائیں اور ہندستان کے ہندوؤں کی طرف سے ضمانت لیں کہ رام جنم بھومی، بابری مسجد کو لینے کے بعد وہ کسی متنازعہ مسجد کو لینے کی کسی صورت میں مانگ نہیں کریں گے۔ عہد نامہ پر انتہا پسند ہندوؤں کی دوسری پارٹیوں اور دلوں کے دستخط بھی ہونے چاہئیں اور ہندستان کی تمام سیکولر پارٹیوں کے اور سرکار بھی اس بات پر راضی ہو جائے کہ پارلیمنٹ میں اس معاہدہ کی توثیق کا بل پاس کیا جائے گا۔ جو اگست ۱۹۴۷ء میں جن عبادت گاہوں کی جو حیثیت تھی ان کو برقرار رکھنے کی ضمانت دے گا۔

عام سوجھ بوجھ کا تقاضا ہے کہ بڑے شر سے بچنے کے لیے چھوٹے شر کو گوارا کر لینا چاہیے۔ اگر یہ معاہدہ ہو گیا تو افہام و تفہیم کی اور راہیں بھی نکل آئیں گی اور سیکولر نقطۂ نظر جو بُری طرح گھائل ہو کر ہو گیا ہے، پھر صدر نشین ہو جائے گا۔

(۱۵ نومبر ۱۹۹۰ء)

کچھ ایسے سوئے ہیں....

ہر صبح جب اخبار آتا ہے تو زمین پاؤں کے نیچے سے سرکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اب پاؤں زمین کے ایک سرے پر ٹِک گئے ہیں۔ بس اس سرے کے نکلنے کی دیر ہے اور اپنی غفلت میں ہم سمجھ رہے ہیں کہ ہمارے قدم مضبوطی سے زمین پر جمے ہوئے ہیں۔ حکومت جنتا دل (س) اور کانگریس کا رخ تیزی کے ساتھ بابری مسجد کے مسئلہ میں مسلمانوں کے خلاف ہوتا جارہا ہے۔ ہمارے نام نہاد ترجمان یہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں اور چونکنے کا نام تک نہیں لیتے۔ انھیں سمجھنا چاہیے کہ اب صاف صاف سامنا بادِ مخالف کا ہے۔ کیسے ملاّح ہیں یہ جو ہوا کے رخ کو نہیں پہچانتے، نہ اس کا اندازہ لگا پارہے ہیں کہ بادِ مخالف تیز ہوتی جارہی ہے، انھیں نہ ہوا کی خبر ہے نہ بادبان کی فکر۔

آج (۹ دسمبر ۹۰ء) کے ٹائمز آف انڈیا کی شاہ سرخی یہ ہے "آندھرا پردیش کے تشدد میں ۳۷ آدمی اور مارے گئے"، ایک اور سرخی ہے "۷ آدمی مارے گئے، فوج بلالی گئی"، ان سات میں سے چار وہ ہیں جنھیں کل صبح گومتی ایکسپریس سے، اسے علی گڑھ کے قریب روک کر، کھینچ لیا گیا اور مار ڈالا گیا۔ غیر سرکاری خبروں کے انوسار (مطابق) ۷ نعشیں ایک محلّہ میں پائی گئیں اور ۳ دوسرے محلہ (قاضی پاڑہ) میں۔ یہ ۳ گولیوں سے ہلاک ہوئے تھے۔ آگ زنی کی کئی وارداتیں ہوئیں ہیں ——————

بلوہ ہوتا ہے تو گرفتاریوں میں مسلمانوں کو حصّہ رسدی سے کئی گنا زیادہ ملتا ہے تاکہ ملازمتوں میں حصّہ رسدی کا عشر عشیر ملنے کی تلافی ہوسکے۔ یہ بات بھی عام ہے کہ ہنگامہ کوئی برپا کرے، پہل کسی کی طرف سے ہو، پی اے سی کی سنگینوں اور رائفلوں کا رخ، عادت کے زور کے باعث، بالعموم مسلمان ہجوم کی طرف مڑ جاتا ہے، نہیں معلوم ان میں کونسی مقناطیسی کشش بھری ہوئی ہے؟ ایسی خبروں کے ہم عادی ہوچلے ہیں کہ یہ اکثر سننے اور پڑھنے میں آتی ہیں، یہاں تشویش ناک بات یہ ہے کہ علی گڑھ اسٹیشن سے آدھے کلومیٹر پہلے جب آفتاب نصف النہار پر تھا (سوا بارہ بجے) مسافروں میں سے چار کو چُن کر اتار لیا گیا اور بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ اردو کو جب اتر پردیش میں ایک سرکاری زبان بنانے کا اعلان کیا گیا تھا

(جسے "مولانا" ملائم سنگھ یادو نے طاق نسیان پر رکھ دیا اور ان سے عقیدت کی بنا پر اردو والے خاموش رہے)، تو بدایوں کے پاس مسلمان مسافروں کو ٹرین سے کھینچ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اس وقت بھی غم و غصہ بے گناہ اور بے بس مسافروں پر اتارا گیا تھا۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ گھر پر رہیں تو گھر کے ساتھ خاکستر ہو جانے کا خطرہ۔ گھر سے نکلیں تو ٹرینوں میں کام آنے کا اندیشہ۔ جن لوگوں کی عمر پچپن (۵۵) سے زیادہ ہے انھیں یاد ہوگا کہ ۱۹۴۷ء میں مسلمانوں کو سرحد کے اس طرف بڑے پیمانے پر (خصوصاً مشرقی پنجاب اور اترپردیش میں) ٹرینوں اور بسوں سے گھسیٹ کر ذبح کیا گیا تھا۔ یہی بہیمیت ۱۹۸۴ء میں سکھوں کے خلاف معرض عمل میں آئی:

یہ بھی یاد رکھیے کہ حکومت اس وقت بہت کمزور اور ڈھلمل یقین ہے۔ وہ کمزوری اور خواہشِ بقا کے تحت شاید کوئی موثر قدم اقلیتوں کی حفاظت کے لیے نہ اٹھا سکے۔ پھر ہمارا کیا حشر ہوگا؟ کیا ہندستانی مسلمان خود کو ان کٹر پنتھی ہندوؤں کی سفاکی اور رحم و کرم پر چھوڑ دیں جو دانت پیس کر رواداری کی پرمپرا (روایت) سے ہٹ گئے ہیں۔ یا ہمیں اپنے طور پر بھی اپنی حفاظت اور دادرسی کا کوئی انتظام کرنا چاہیے، اور اس کے علاوہ کیا ہمیں سیکولر پارٹیوں، جماعتوں اور افراد کے ساتھ اپنے ناتے کو مضبوط کرنا ہوگا۔ مزید برآں کیا دوسری اقلیتوں مثلاً سکھوں، عیسائیوں، بدھوں جینیوں، پارسیوں کی تائید اور ہمدردی حاصل کرنا ہم پر واجب ہے، اور اس کے علاوہ اور ان سب سے بڑھ کر، کیا یہ اشد ضروری نہیں ہے کہ ہم درجِ فہرست ذاتوں اور قبیلوں (شیڈیولڈ کاسٹس اینڈ ٹرائبس) سے تعلقات کو برابری اور ہم مقصدی کی سطح پر بہت استوار کر لیں۔

آپ کہیں گے کہ ان سب سوالوں کا ایک ہی جواب ہے: ہاں۔ پھر ہم اس راہ پر کیوں نہیں چلتے، ہم اس نسخۂ کیمیا، اس تدبیر بقا کو استعمال کیوں نہیں کرتے۔ کیا کلام پاک کی یہ وعید ہم پر صادق آتی ہے؟

صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ فَھُمْ لَا یَرْجِعُوْن

وہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، وہ (راہ راست کی طرف) واپس نہیں آئیں گے

خدارا سمجھ سے، ہوش و گوش سے کام لیجیے اور جس راہ کی نشان دہی اوپر کی گئی ہے، اس پر چلنا شروع کیجیے۔ ہندستان کے دوسرے مظلوموں اور محروموں کو اپنے ساتھ لے کر چلیے۔ ظلم کی ٹہنی کبھی پھلتی نہیں، لیکن شرط ہے کہ مظلوم ظلم کے روکنے کا ساہس (حوصلہ) اور اپنے بچاؤ کی تدبیر تنظیم کے ساتھ کرے۔

لیکن مذکورہ بالا دونوں خبروں سے زیادہ تشویش پیدا کرنے والی خبر یہ ہے کہ شری ناناجی دیش مکھ نے جو بارہ سال ہوئے عملی سیاست سے سبکدوش ہو گئے تھے تہیہ کر لیا ہے اور منصوبہ بنا لیا ہے کہ وہ فروری سے پوری تیاری کے بعد سارے

دلیش کے دورے پر نکلیں گے۔ ان کا مدعا ہے کہ ان لوگوں کو جو رائے عامہ یا پبلک اوپی نین بناتے ہیں، اقلیت موافق سیکولرزم سے کنارہ کش کر دیا جائے۔ ان کی نگاہ میں کسی طرح کا اور کسی کے ساتھ امتیاز ناروا ہے۔ ناناجی اکثریت کے نشہ میں بہک کر یہ سمجھ رہے ہیں کہ اس ملک میں مسلمانوں کے حق میں امتیاز برتا جا رہا ہے۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

یہ اسی امتیاز کا نتیجہ تو ہے کہ مسلمانوں کی تعلیمی، اقتصادی اور سماجی حالت دن بہ دن بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ اتنی بدتر کہ آزادی کے بعد کسی حکومت کی یہ ہمت نہیں ہوئی کہ فرقہ وارانہ تعلیم کی شرح کے ان اعداد و شمار کو چھاپ دے جو گزشتہ چار مردم شماریوں کے دوران جمع کیے گئے ہیں۔ مسلمانوں کے ساتھ سرکار کی مرحمت خصوصی کا ہی تو یہ نتیجہ ہے کہ سرکاری نوکریوں میں مسلمانوں کی تعداد اب برائے نام رہ گئی ہے۔ حکومت کی چھتر چھایا کے باعث ہی تو دنگوں اور بلووں میں مرنے والوں اور ان کے عقب میں گرفتار ہونے والوں میں مسلمانوں کی اکثریت رہتی ہے۔ ناناجی نے یہ بھی فرمایا کہ "مسلمان کہتے ہیں اگر تم ہمارے دین کو قبول نہیں کرتے تو تم کافر ہو۔ ایسا کیوں ہے۔ اگر سب لوگ اللہ کی مخلوق ہیں تو اللہ کی ساری مخلوق سے محبت کرنی چاہیے"۔ یہاں ناناجی سے سمجھنے میں سہو ہوا ہے۔ مسلمان ہندوؤں کو ہندو کہتے ہیں کافر نہیں کہتے۔ کافر آغازِ اسلام کے ان لوگوں کے لیے استعمال ہوا تھا جنھوں نے اسلام کو قبول کرنے سے انکار کیا اور یہی اس لفظ کے معنی ہیں، اس میں نہ تحقیر ہے نہ کدورت۔ لیکن اس لفظ کو ہم ہرگز اپنے برادرانِ وطن کے لیے استعمال نہیں کرتے کہ اسلام کا صحیفہ قرآن کہتا ہے کہ "تمھارے لیے تمھارا دین، اور ہمارے لیے ہمارا دین"، کفر و ایمان کا جھگڑا ہی اس طرح مٹ جاتا ہے۔ ناناجی نے انڈین ایکسپریس میں جو مضمون (۲۶ نومبر) چھپوایا تھا اس سے اس کا نقطۂ نظر بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ وہ مبنی ان مفروضات پر تھا کہ ہندستان ہندوؤں کا دیس ہے اور جو پارٹیاں خود کو سیکولر کہتی ہیں وہ دکھاوے کے لیے سیکولر ہیں اور کثرت میں وحدت کا مفہوم یہ ہے کہ کثرت وحدت میں ضم ہو جائے۔ راقم حروف نے اڈیٹر کے نام اپنے خط میں ان مفروضات پر سوالیہ نشان لگایا ہے (۹ نومبر ۹۰ء)

افسوس ہے کہ بات نفسِ مضمون سے آگے بڑھ گئی۔ راقم صرف اس بات پر زور دینا چاہتا تھا کہ انتہا پسند ہندوؤں کے یہاں تنظیم ہے، منصوبہ بندی ہے محنت ہے، ریاضت ہے اور رائے سازی کی ملک گیر کوشش ہے ہمارے یہاں اس کے مقابلے میں کرسیوں پر بیٹھ کر گھنٹوں اس مصالحت کی جس کے دروازے بھاجپا نے بند کر دیے ہیں، بے مصرف اور شہرت بخش گفتگو ہیں ہیں۔ گفتار کے

غازی ہمارے یہاں بہتیرے ہیں۔ کردار کا غازی ایک بھی نہیں۔ ان محترم زعما اور رہنماؤں کا حال جو اس وقت وشو ہندو پریشد سے گفتگو کر رہے ہیں یا شری چندر شیکھر کے دروازے پر دستک دے رہے ہیں، یا ان کی بے مہری پر برہم ہیں، اودھ کے آخری نواب واجد علی شاہ کا سا ہے جسے طاقت کے بدلے ہوئے توازن کا اندازہ اس وقت ہوا جب انگریزوں نے اس کی حکومت کو زیر و زبر اور اس کو کلکتہ میں نظر بند کر دیا۔

آج کے اخبار میں ایک بات اور ہے جس کی طرف ہمارے ترجمانوں کو دھیان دینا چاہیے۔ اس میں لکھا ہے کہ یوپی کا عام مسلمان ان خونریزیوں اور مصیبتوں سے تنگ آ گیا ہے جن کا وہ بابری مسجد تنازعہ کی وجہ سے ہدف بنا ہے اور وہ اپنے رہنماؤں کی بے حسی اور بے دردی کو اب زیادہ دیر تک برداشت نہیں کرے گا۔ دراصل ان رہنماؤں کے ہاتھوں میں وہ اختیار ہے جس کے ساتھ ذمہ داری جڑی ہوئی نہ ہو۔ ہمارے خود ساختہ رہنماؤں اور ترجمانوں کو اگر مسلمانوں کے نمائندوں کی حیثیت سے مذاکرہ کرنے کا اختیار مل گیا ہے، تو اس کے ساتھ مسلمانوں کی حفاظت کا اہتمام کرنے کی ذمہ داری بھی تو ان پر آتی ہے۔ نانا جی دیش مکھ (اور ان جیسے بے شمار آر ایس ایس اور بی جے پی کے مفکر رہنما اور کارکن) ہندستان کے طول وارض میں دورہ کرنے والے ہیں (ان میں سے بہت سے معمول کے طور پر ایک عرصے سے یہی کام کر رہے ہیں) تاکہ ہندوؤں کو منظم کیا جائے اور مسلمانوں کی انفرادیت اور تشخص کے خلاف رائے عامہ تیار کی جائے۔ اور مسلمان؟ وہ ملک کی راجدھانی میں آرام دہ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ایک کبھی نہ ہونے والے معاہدہ کے ش ق اور نوک پلک درست کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ انھیں خبر نہیں کہ صنم خانہ سے جو پاسبان کعبہ کو مل گیا تھا وہ بھی خود کعبہ کو ڈھا کر صنم خانہ بنانے کی فکر میں ہے اور بڑی سیاسی پارٹیاں جو سیکولر کا پرچم لے کر چلی ہیں اس بات سے فکر مند ہیں کہ ہندوؤں کی اکثریت کو بھاجپا نے اپنی جھولی میں ڈال لیا ہے اس وقت ان کا سارا جھکاؤ ہندوؤں کو خوش کرنے کی طرف ہے، اشتراکی یا ترقی پسند پارٹیوں کو فی الحال اس کلیہ سے مستثنا سمجھنا چاہیے، لیکن ان کے عارضی حلیف وشوناتھ پرتاپ سنگھ صاحب کو نہیں، جن کی خو سیاسی ہوا کے رخ پر چلنے کی ہے۔ لیکن ترقی پسند پارٹیوں کو ملک کے عوام خاطر میں لاتے ہی کب ہیں؟

علماء کرام کو اس بحث کی طرف بھی دھیان دینا چاہیے جو اس وقت ہندوؤں کے ترجمان ڈاکٹر ایس پی گپتا اور ممتاز ترقی پسند مورخین پروفیسر آر ایس شرما اور پروفیسر رومیلا تھاپر کے درمیان رام جنم بھومی کے بارے میں چھڑی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر ایس پی گپتا کے دلائل و شواہد اتنے کمزور ہیں جتنی ان کی مورخانہ حیثیت لیکن

اگر ان ترقی پسند مورخین کی جن کے قدوقامت کا کوئی مورخ منکر نہیں ہو سکتا، بات مانی جائے تو بھی یہ بات سامنے آتی ہے کہ جس جگہ پر بابری مسجد بنی ہے اغلب یہ ہے کہ اس پر ایک زمانہ میں بدھ عبادت گاہ کھڑی ہوئی تھی۔ یہ فیصلہ ہمارے علماء اور فقہا کو کرنا ہوگا کہ آیا وہ مسجد جو ایسی جگہ پر بنی ہے دراصل بہ حیثیت مسجد کے ازروئے شرع تسلیم کی جاسکتی ہے؟ رائے چاہے پروفیسر آر ایس شرما کی مانی جائے، چاہے ڈاکٹر ایس پی گپتا کی، یہ بات بظاہر ثابت ہے کہ جس جگہ اس وقت بابری مسجد کی عمارت ہے وہاں پہلے بدھوں یا ہندوؤں کی عبادت گاہ ضرور تھی۔ چونکہ رام جنم بھومی۔ بابری مسجد نزاع نے ہندستانی مسلمانوں کے جان و مال، عزت و آبرو، امکانات اور مستقبل کو خطرے میں ڈال دیا ہے، اس لیے کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم مذکورہ مسجد سے دست کش ہونے کے شرعی جواز پر سنجیدگی اور دردمندی کے ساتھ غور کریں اور اس تنگ و خشک موشگافی میں نہ پڑ جائیں کہ وقفہ حائل ہو رہا ہے، تمادی عارض ہو رہی ہے۔ ہمیں اس مسئلہ کی روح کو سمجھنا چاہیے کہ دوسرے مذہب کی عبادت گاہ کی جگہ مسجد بنانا کیوں جائز نہیں ہے۔ راقم سطور اپنی بے بضاعتی کے باوجود یہ یقین رکھتا ہے کہ یہ مسئلہ جہاں تک کہ اس کی روح کا تعلق ہے لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْن اور لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ سے مستخرج ہے۔ کیا دانشمندی کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ شرع ہم کو جو عذر دے رہی ہے اور اسلام نے ہم کو جو کشایش اور وسعت دی ہے اسے استعمال کرتے ہوئے ہم اپنی ملت کو ملک گیر اور متواتر مظالم، شدائد اور مصائب سے بچالیں۔ کیا جب مسجد پر ہمارا کوئی اختیار نہیں رہے گا اور جب بیشتر سیاسی پارٹیاں بھی اس کو ہندوؤں کے ہتھیا لینے کے حق میں ہو جائیں گی اس وقت ہم ہندوؤں سے کہیں گے کہ ہم بابری مسجد تمھیں دے رہے ہیں۔ اس وقت وہ ہمیں جس نظر سے دیکھیں گے اس کا اندازہ آپ سب لگا سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں شلا پوجن، شلا نیاس، جیوتی یاترا، رتھ یاترا اور استھی کلش کے حربے متھرا اور کاشی کی مسجدوں کے خلاف استعمال کیے جائیں گے اور ہندستان کی ندیوں کا رنگ شہیدوں کے خون سے لالہ گوں ہو جائے گا۔ کیا اتنی سی بات ہماری سمجھ سے باہر ہے؟ ہم ایک متنازعہ اور مشتبہ مسجد دے کر باقی ساری متنازعہ مسجدوں اور ہزاروں جانوں کو بچاتے اور اس ملک میں بے فکری خوشحالی اور خیرسگالی کے ساتھ جینے کی شروعات کر سکتے ہیں۔ پھر کرتے کیوں نہیں؟ مسلمانوں کی صورت حالات اور اس بدقسمت نزاع کے جو رخ سامنے آرہے ہیں ان پر سنجیدگی، ذمہ داری، ہوشمندی، سرعت، دردمندی اور دوراندیشی کے ساتھ غور کرنا چاہیے۔ دیر کیجیے گا تو زمین پاؤں کے نیچے سے بالکل نکل جائے گی اور پانی سر کے اوپر سے گزر جائے گا۔

(۹ دسمبر ۱۹۹۰ء)

مسلمان رہنماؤں کے نام ایک خط

آپ کا یہ خادم ایک عرصے سے یہ محسوس کر رہا ہے کہ بابری مسجد کے قضیہ میں مسلمانوں کی قیادت کا اندازِ فکر ملت کے دور رس اور دیرپا مصالح کے خلاف ہے۔ ہم ابھی تک اس دھوکے میں تھے کہ ملک کی سیکولر پارٹیاں ہماری تائید کریں گی اور پولیس نیم عسکری اور عسکری طاقتیں شہریوں کے تحفظ اور امن وامان قائم رکھنے کا اپنا فرض ادا کرتے ہوئے ہماری حفاظت کریں گی۔ اب ہم نے اچھی طرح دیکھ لیا کہ سیکولر پارٹیاں دل سے ہمارا ساتھ نہیں دے رہی ہیں اور اس نزاع کے بارے میں ان کے رویّہ میں تبدیلی اور ڈھیل آرہی ہے۔ پہلے بھی رتھ یاترا کو روکنے یا اس کے روکے جانے کا مطالبہ کرنے کے لیے انھوں نے کوئی مؤثر عملی قدم نہیں اٹھایا تھا۔ شری ملائم سنگھ یادو نے کارسیوا کو روکنے اور اس وقت اترپردیش میں بڑی حد تک امن قائم رکھنے میں جواں مردی اور انتظامی صلاحیت کا ثبوت دیا تھا لیکن اب ان کا رُخ بالکل بدل گیا ہے۔ غالبًا انھیں اب فکر لاحق ہے اپنی سیاسی بقا اور ہندو سماج میں اپنی ساکھ کو بحال کرنے کی۔ ان کے احکام اور پالیسی میں وہ وضاحت اور صلابت باقی نہیں رہی جس کے زیرِ اثر انتظامیہ نے شہریوں اور انصاف کے اصولوں کا تحفظ کیا۔ چنانچہ اترپردیش میں اقلیت کشی نے کہرام برپا کر رکھا ہے۔

حالات جب اس حد تک بدل گئے ہوں تو زندگی یہ تقاضا کرے گی کہ ہم اس قضیہ سے متعلق اپنے رویّہ پر نظرِ ثانی کریں۔ ہمیں یہ مان کر چلنا ہوگا کہ میزان میں ایک طرف ایک مسجد ہے جس پر اغیار نے قبضہ کر رکھا ہے اور جسے بُت خانہ بنا دیا ہے۔ ان ہزاروں مسجدوں کی طرح جو ۱۹۴۷ء کے حشر ساماں ایام میں غیروں کے قبضہ میں چلی گئیں اور جن پر آج تک ان کا قبضہ ہے، جن کے متعلق عرصۂ دراز سے کوئی صدائے احتجاج بلند نہیں کی گئی۔ (اس غاصبانہ قبضہ کو ایک لحاظ سے چار سال ہوگئے اور دوسرے زاویہ سے ۳۷ سال، کیونکہ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۸۶ء تک مسجد مقفل اور سرکار کے تصرف میں اغیار کے توسط سے رہی) میزان میں دوسری طرف وہ مسجدیں ہیں جنھیں مختلف مقامات پر حالیہ فسادات کے دوران بے حرمت، مسمار، یا شکست کیا گیا اور وہ ہزاروں مسجدیں جو فسادات کے پھیل جانے کی صورت میں عداوت کا نشانہ بنیں گی اور

ہزاروں لاکھوں بے گناہوں کی جانیں جو دالو پر یا تو لگی ہوئی ہیں یا لگ جائیں گی اور ان سب سے بڑھ کر سکون، اعتماد اور حوصلہ کی شکست و ریخت جو آج کل مسلم معاشرہ میں ہر طرف دیکھنے میں آرہی ہے اور وہ ترقی معکوس جس کی منزلیں ہم خوف اور دہشت کے عالم میں تیزی کے ساتھ طے کر رہے ہیں۔ تعلیم اور تعمیر ترقی اور پیش رفت کے سارے منصوبے کھلونوں کی طرح ٹوٹ کر بکھر گئے ہیں۔ ایودھیا کے قضیہ نے شمالی ہندستان کے مسلمانوں کو پچاس سال پیچھے دھکیل دیا ہے۔ غور فرمائیے کہ ترازو کا کون سا پلہ بھاری ہے۔

ہمارے ترجمانوں نے بار بار یہ بات کہی ہے کہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ بابری مسجد مندر کو توڑ کر بنائی گئی ہے تو وہ اسے ہندوؤں کے حق میں واگزار کر دیں گے کیونکہ کسی زمین پر غاصبانہ مسجد بنانا اسلام کی نگاہ میں جائز نہیں ہے۔ یہ دلیل ان ساری مسجدوں (بہ شمول کاشی و متھرا) کے خلاف جائے گی جو سلطنتی مصلحتوں کی بنا پر مندروں کو توڑ کر بنائی گئی تھیں۔ ہم بادشاہوں کی اس روش اور قدیم اور متوسط دور کی اس عام وضع سے برأت کا اظہار کرتے ہیں کہ ایک شہر یا ایک عمارت یا ایک عبادت گاہ کسی دوسرے شہر یا عمارت یا عبادت گاہ کے ملبہ سے بنائی جائے۔

یہ بات بھی خاطر نشین کر لینی چاہیے کہ بھاجپا نے اپنی مسلم دشمن تحریک کے لیے انتہائی دانشمندی کے ساتھ وہ نام چُنا جو ہمارے ہر ہندو بھائی کے دل میں اور زبان پر ہے۔ یعنی رام۔ اس افواہ نے کہ مسلمان بھگوان رام کی جنم بھومی پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں رام کا نام لینے والے سب ہندستانیوں کو مسلمانوں کے خلاف کر دیا۔ ٹی وی پر رامائن کے سیریلوں نے میدان پہلے ہی ہموار کر دیا تھا۔ شلا پوجن نے ہندستان کے ساڑھے پانچ لاکھ گاؤں میں مسلم دشمنی کی آگ سلگادی۔ جیوتی یاترا، رتھ یاترا اور استھی کلش نے جذبات کو بھڑکا دیا۔ اس وقت کسی ہندو کو خواہ وہ عام شہری ہو، خواہ پولیس، پی اے سی یا ملٹری فورسز کا جواں ہو، مسلمانوں سے ہمدردی نہیں ہے، خواہ سیکولرزم کا نام لینے والے حضرات کچھ ہی کہیں۔ یہاں دو باتیں توجہ طلب ہیں (۱) مسلمانوں کے لیے کیا یہ دانشمندی کی بات ہے کہ وہ سارے ہندوؤں کو برہم یا آمادۂ عناد کر دیں۔ (۲) ہندوؤں نے جو تحریک اس قدر منصوبہ بندی تنظیم، سلیقہ اور جفاکشی کے ساتھ چلائی، اس کے جواب میں کیا مسلمانوں نے بھی کسی تنظیم یا تحریک کا ثبوت دیا۔ عجیب ستم ہے، جن لوگوں کے پاس حکومت کی طاقت اور پشت پناہی ہے وہ اپنی تحریک کے لئے دن رات ایک کر دیں اور ایک لہر سارے بھارت ورش میں دوڑا دیں؛ اور وہ اقلیت جو ہر طرف سے عداوت یا غفلت کا ہدف بن رہی ہے، ایک قدم چل کر نہ دے اور اپنا وقت لایعنی اور لاحاصل مذاکرات میں صرف کر دے۔

راقم عریضہ آپ سے دست بستہ التماس کرتا ہے کہ مسئلہ پر پھر سے غور فرمالیے قبل اس کے کہ پانی سر سے گزر جائے۔ یاد رکھئے کہ بابری مسجد ہمیں ملنے والی نہیں ہے، ان ہزاروں مسجدوں کی طرح جن پر پنجاب، ہریانہ اور دہلی میں اغیار نے غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے۔ ایسی صورت میں اور ملک کی موجودہ تناؤ انگیز اور خوں ریز صورت حالات کو دیکھتے ہوئے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم بابری مسجد

کو موجودہ جگہ سے منتقل کیے جانے پر راضی ہو جائیں اور دوسری متنازعہ مساجد کے تحفظ کا محکم اخلاقی اور قانونی انتظام کر لیں۔ راقم یہ سمجھتا ہے کہ ایک بہت بڑے ملک گیر اور دیرپا شر سے بچنے کے لیے ایک چھوٹے شر کو گوارا کرنا قرینِ دانش ہے۔ علاوہ بریں یہاں "رخصت" کے قانون کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ اگر عذرِ شرعی درکار ہے تو یہ کیوں نہ کہا جائے کہ آرکیالوجسٹس (باستان شناسوں) میں جو بحث حال ہی میں چھڑی وہ اس بات پر یک گونہ متحد ہے کہ جہاں بابری مسجد بنی ہے۔ اس جگہ پہلے بدھ یا ہندو عبادت گاہ ضرور تھی، گمان غالب ہے کہ یہ بدھ عبادت گاہ تھی۔ پہلے بنی ہوئی عبادت گاہ کو حق تقدیم ملنا چاہیے، لہٰذا بابری مسجد کے دوسری عبادت گاہ کی جگہ پر بنائے جانے کا کوئی شرعی جواز ہے ہی نہیں۔

راقم حروف یہ جانتا ہے کہ اس طرح ہمیشہ کے لیے ہندو مسلم اختلافات اور انتہا پسندوں کے مطالبات ختم نہیں ہوں گے۔ لیکن اکثریت کا ایک بڑا طبقہ مسلمانوں کی اس مصالحانہ پیش کش کا خیر مقدم کرے گا؛ اور ایک عام فضا خیر اندیشی کی ملک میں پیدا ہو جائے گی؛ اور ہم دونوں کو مل بیٹھ کر جھگڑے ختم کرنے کی عادت پڑے گی۔ اس تجویز کے خلاف یہ دلیل دی جائے گی کہ اگر مسجد کو دینا ہی تھا تو رتھ یاترا اور تناؤ اور مار کاٹ سے پہلے ہی یہ فیصلہ کیوں نہ کر لیا گیا۔ لیکن ایک صحیح فیصلہ اگر پہلے نہیں کیا گیا اور اس کی وجہ سے جان مال آبرو ساکھ کا زبردست نقصان ہو گیا تو یہ کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم صحیح فیصلہ اب نہ کریں اور مزید نقصان سے بچنے کی سبیل نہ نکالیں۔

ایک التماس اور بھی ہے۔ مسلم عوام جو بری طرح گھائل ہوئے ہیں اپنے کرسی نشین رہنماؤں سے بہت بدظن ہیں۔ ان کی بدگمانی کے ایک جزو کو دور کرنے کے لیے ہمارے رہنماؤں اور علمائے کرام کو چاہیے کہ ایودھیا جا کر مسجد کے اندر یا مسجد کے باہر نماز پڑھیں۔ راقم جس کی کوئی بساط نہیں اس مہم پر علما اور زعما کی پیروی کرنے کے لیے تیار ہے۔ خدا نہ کرے مؤرخ ہمارے رہنماؤں کے متعلق یہ کہے کہ ان لوگوں نے کمال بے دردی سے مسلم عوام کو کٹنے لٹنے اور برباد ہونے دیا اور تنظیم کے ساتھ مؤثر انداز سے ایودھیا جانے کی زحمت نہیں کی یا اپنے لیے کوئی خطرہ مول نہیں لیا۔

ہندوستان کے مسلمانوں کا ایک بہت بڑا سرمایہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی ہے؟ آپ کو شاید اندازہ نہ ہو کہ وہ اس وقت نرغۂ اعدا میں ہے۔ ہر شخص وہاں سہما ہوا ہے ضلع کی انتظامیہ کا اصرار ہے کہ ہوسٹلوں کو خالی کرا دیا جائے۔ کل فورس نے اپنے مطالبہ کو منوانے اور اظہار برہمی کرنے کے لیے ہتھیار رکھ دیے ہیں۔ ہندی اخباروں میں افواہیں چھپ رہی ہیں؛ حتیٰ کہ ٹی وی نے بھی فورس کے تئیں طلبہ کے رویہ کے بارہ میں بے بنیاد خبر نشر کر دی۔ پہلے وائس چانسلر کے انتخاب میں ناروا تاخیر ہوئی۔ اس کے نتیجہ میں داخلوں کی تکمیل بہت دیر سے ہو پائی۔ خدا خدا کر کے پڑھائی شروع ہوئی تھی کہ فسادات اور خوف کے منحوس سائے ہماری یونی ورسٹی پر پڑنے لگے۔ اب مجبوراً یونی ورسٹی کو بند کر دیا گیا ہے۔ خدا کرے

کہ یہ سال بچ جائے پڑھائی تو مجروح ہو ہی گئی۔ یہ بیچارے دوسروں سے مقابلہ کیسے کریں گے۔ ایودھیا کے قضیہ سے سب سے بڑا نقصان ہمارے اقبال اور اعتماد اور سکون کا ہوا، اور اس کے بعد ہماری تعلیم اور مقابلہ کی صلاحیت کا۔

خدارا ملّت کو ان بھیانک خطرات سے بچایئے جو اس کے سر پر منڈلا رہے ہیں۔ یہ آپ کے قبضۂ اختیار میں ہے۔ انصاف کا تقاضہ یہ بھی تو ہے کہ آپ مسلم عوام کی حفاظت کے کریں اور اگر ان کی حفاظت نہیں کر سکتے تو ان کے ساتھ رہ کر ان خطرات میں شریک ہوں جو ہمارے زاویۂ نگاہ اور طرزِ عمل نے پیدا کر دیے ہیں۔

(۱۴؍دسمبر ۱۹۹۰)

ایودھیا کے بعد کیا؟

۶؍دسمبر کو جو قیامت برپا ہوئی اس نے ہندستان کو ہلا ڈالا اور مسلمانوں کے سکون، ان کی سلامتی اور ان کے حقوق کو تہس نہس کر دیا۔ مسلمانوں کو اپنی اوقات معلوم ہوگئی، وہ سوچنے لگے کیا اپنے وطن میں ہم عزّت کے ساتھ رہ سکیں گے۔ کیا یہاں ہم آزادی کا سانس لے سکیں گے کیا ہمیں عبادت کی اجازت ہوگی، کیا ہمارے مذہب، ثقافت اور روایات بالآخر محفوظ رہ سکیں گی۔ یا جس طرح ان کی مسجد منہدم کی گئی ہے اسی طرح وہ سب کچھ جو انھیں عزیز ہے، جس سے وہ پہچانے جاتے ہیں، مسمار کر دیا جائے گا۔ کیا تعداد کو قانون پر بالادستی حاصل ہوگئی ہے؟ کیا اکثریت کو یہ اختیار ہے کہ وہ اقلیت کو روندتی چلی جائے۔ آئین کو بالائے طاق رکھے، قانون کی دھجیاں بکھیر دے، عدالتوں کی حکم عدولی برملا اور علی الاعلان کرے۔ کیا ہندستان کے ہر باشندے کو ہندویت (ہندتو) کے آگے سربسجود ہونا پڑے گا کیا اس ملک میں حکومت جمہور کی نہیں ہے، اکثریت کی ہے، اور اقلیتیں اکثریت کی رعایا ہیں اور ان کے رحم وکرم پر یہاں زندگی گزار رہی ہیں۔ کیا رواداری کی پرمپرا ایک سراب ہے، کیا سیکولرزم کا دعوا ایک فریب ہے۔ کیا ہندستان ایک دھارمک ریاست ہے جہاں ہندو دھرم کو فضیلت حاصل ہے اور باقی سب دھرم ریاست کے دھرم کے تابع فرمان ہیں؟ کیا مساوات کے یہ سارے دعوے باطل ہیں؟ کیا جمہوریت کا ایوان دھوکے کی ٹٹی ہے؟

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب تو سمجھتا ہے کہ آزادی کی ہے نیلم پری

بابری مسجد کیا شہید ہوئی، مسلمانوں کے دل ٹوٹ گئے، پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ جگنّاتھ آزاد کہنے لگے ہم آپ کو مُنہ دکھانے کے لائق نہیں رہے۔ مسلمان سرنگوں ہیں ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اب سر اٹھا کر کیسے چلیں گے، وہ خدا کے گھر کی حفاظت نہ کرسکے، وہ نامُراد اب کس لیے جئیں گے۔ ان کے سینے کھوکھلے ہوگئے ہیں۔ جن سے رہا نہیں گیا وہ کفن باندھ کر سڑکوں میں آگئے اور نہ معلوم کتنوں نے جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ جن میں نکلنے کا یارا نہ تھا وہ کڑھ رہے ہیں سُلگ رہے ہیں خون کے آنسو رو رہے ہیں۔ مسجد کو رُوئیں کہ شہیدوں کو۔ (شہید دونوں ہی ہوئے)

حیراں ہوں دل کو رُوؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

لوگ کہیں گے کہ مسلمان تنہا نہیں ہیں، وہ بے یار و مددگار نہیں ہیں، ان کے ہم وطن ان کے ساتھ ہیں۔ یہ شکست مسلمانوں کی، ان کے مذہب کی شکست نہیں ہے۔ یہ شکست اعلا انسانی قدروں کی شکست ہے، جمہوریت اور سیکولرزم اور مساوات اور انصاف کی شکست ہے۔ بی جے پی، وشو ہندو پریشد اور آر ایس ایس کا ہندستان پر کوئی اجارہ نہیں۔ سیاسی پارٹیوں کو دیکھیے تو بھاجپا کے علاوہ ساری پارٹیاں کل کے اتیاچار سے تلملا اٹھی ہیں، وہ مظلوم اقلیت کا ساتھ دینے پر تلی ہوئی ہیں، انھیں فکر ہے کہیں ہندستان جمہوری اور سیکولر قدروں کو ترک نہ کر دے، یہاں دھرمانند کا بول بالا نہ ہو جائے، یہاں مذہبی ریاست وجود میں نہ آجائے۔ زخم خوردہ مسلمان جو خاک چاٹ رہے ہیں یہ تسلیم کرتے ہیں کہ بھاجپا کو چھوڑ کر سارا ہندستان ان کا ہمدرد اور غمگسار ہے، اور یہ کوئی چھوٹی بات نہیں۔ لیکن وہ ایک بات بھول رہے ہیں۔ بھاجپا کے پاس "کارڈ" ہے، منصوبہ ہے، پروگرام ہے، اور یہ جذبہ ہے کہ سارے ہندستان کو ہندو رنگ میں رنگ دیا جائے اور جو یہ رنگ قبول کرنے سے انکار کرے اُسے نکال باہر کیا جائے۔ اب یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ آر ایس ایس اور بی جے پی کا اثر شہروں تک محدود ہے اور دیہات انتہا پسندی کے زہر سے پاک ہیں۔ یہ زہر تو ہندستان بھر میں پھیل گیا ہے، ایک بڑی کثیر تعداد کی رگ جاں میں پیوست ہو گیا ہے۔ اکثریت کے بیشتر افراد، چاہے وہ شہر میں رہتے ہوں چاہے دیہات میں، وہی سوچتے ہیں جو بھاجپا چاہتی ہے۔ یاتراؤں نے اور سادھوؤں نے پورے ملک کی فضا کو مسموم کر دیا ہے۔ راجستھان اور جنوبی ہند کی ریاستیں فرقہ پرستی سے پاک تھیں، آر ایس ایس کی کوششوں کی بدولت اکثریتی فرقہ پرستی کا چلن وہاں بھی ہو گیا ہے دوسری سیاسی پارٹیوں نے جہاں تک تنظیم، توسیع اور تبلیغ کا تعلق ہے بھاجپا کو ایک عرصہ واک اوور دے رکھا ہے۔ مسلمانوں کو دوسری پارٹیوں کے مثبت ردّعمل کی پذیرائی ضرور کرنی چاہیے لیکن ایک پل کے لیے بھی یہ سوچنا مہلک ہوگا کہ یہ پارٹیاں مل کر بھی بی جے پی کا مقابلہ کر سکتی ہیں، یا یہ آڑے وقت میں مسلمانوں کا دفاع یا ان کی دستگیری کے لیے کمر کس پائیں گی۔ بی جے پی کو ہندوؤں کی اکثریت زبان سے یا دل سے اپنا ترجمان مانتی ہے۔ ساری پارٹیاں سالوں سے یہ دیکھ رہی تھیں کہ بھاجپا اور اس کی ہم رنگ جماعتیں روشنی کو پسپا اور ذہنوں کو مسموم کر رہی ہیں، شاکھاؤں، یاتراؤں، تحریروں، تقریروں اور کیسٹوں کے ذریعے مسلمان بھی یہ دیکھ رہے تھے لیکن نہ ان سیاسی پارٹیوں نے، نہ خود مسلمانوں نے، ہندو انتہا پسندی کی روک تھام کا کوئی سرو سامان کیا۔ زہر بھرے پروپیگنڈے اور نفرت بھرے دروغ کا جواب دینے، اس کا ازالہ کرنے کی کوئی کوشش بھی کسی نے نہیں کی۔ جمہوریت آزادیِ رائے، سیکولرزم، رواداری اور احترام عقائد و مذاہب کے خلاف ہندو عوام کی عدالت میں فیصلہ یک طرفہ کر دیا گیا۔ بنی نوع انسان نے جب سے اینٹیں ایجاد کیں اور شہر بسائے اینٹیں

آبادی کے ہی کام آتی رہیں، بربادی کے کام کبھی نہیں آئیں، لیکن وشو ہندو پریشد اور بھاجپا نے اینٹوں کے طریق استعمال کو بالکل اُلٹ دیا۔ شلانیاس یعنی بظاہر رام مندر کے تعمیر کے لیے ہندستان بھر سے پوجی ہوئی اینٹوں کو ایودھیا میں جمع کیا گیا۔ یہ ساری تیاریاں بابری مسجد کی اینٹ سے اینٹ بجانے اور اسے منہدم کرنے کے لیے تھیں۔

صفائی کے طور پر کوئی کہہ سکتا ہے کہ "یہ سب کچھ بی جے پی کے ارادوں اور منصوبہ کے خلاف اچانک عمل میں آگیا، دیکھیے شری کلیان سنگھ نے فوراً استعفیٰ دے دیا۔ اور بی جے پی کے سب سے بڑے رہنما شری اڈوانی ایوان میں حزب مخالف کی لیڈری سے مستعفی ہوگئے۔" سوچیے ان دکھاوٹی استعفوں کی اہمیت ہی کیا ہے۔ یہ تو کام کو انجام دینے کے بعد کمر کھول دینے کا سا انداز ہے۔ ابھی رات گئے دور درشن میں اس مسئلے پر گفتگو کے دوران ڈاکٹر ہیپ سنگھ نے جو ہندی کے ایک ممتاز مصنف اور ممبر ہیں پینل کے ایک دوسرے رکن سے کہا کہ "پچھتاوے اور پشیمانی کی حکایت کو زیادہ نہ بڑھایئے۔ اگر یہ صاحبان واقعی پشیماں ہیں تو انھیں اجتماعی طور پر اس کا اظہار کرنا چاہیے اور مسلمانوں سے معافی مانگنی چاہیے۔ آپریشن بلیواسٹار کے بعد اگر سکھوں سے معافی مانگ لی جاتی تو پنجاب کی کیفیت آج بالکل مختلف ہوتی۔ بھاجپا کی منفعل قیادت مسجد کو اسی جگہ پہ بنانے کی ذمّے داری کیوں نہیں لیتی؟" ڈاکٹر ہیپ سنگھ کی بات سے یہ اندازہ لگایئے کہ ہندستان میں اقلیتیں خود کو غیر محفوظ سمجھ رہی ہیں، باوجود اس کے کہ یہ گوتم بدھ اور گاندھی کا ملک ہے اور اہنسا یہاں کی پرمپرا ہے۔ ہندوؤں کو اور اربابِ اقتدار کو ٹھنڈے دل کے ساتھ اس صورتِ حالات پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ اپنی پیٹھ ہم ہندستانی ایک عرصہ سے ٹھونکتے چلے آئے ہیں، اب وقت آگیا ہے گریبان میں مُنہ ڈالنے اور دل کو ٹٹولنے کا۔ رواداری کی روایت کا ذکر کرکے (جو اب متروک ہوچکی ہے)، ہم خود کو دھوکا دے سکتے ہیں دوسروں کو مطمئن نہیں کرسکتے۔ ان کی نگاہ میں تو یہ زخموں پر نمک پاشی کا عمل ہے۔

ہندوؤں کی انتہا پسند جماعتوں کے بعد اس شرمناک حادثہ، اس راکششی فعل کی ذمّے داری سرکار پر جاتی ہے۔ اپنے ارد گرد نظر ڈالیے جو شخص فیصلہ نہ کرسکے، جو وعدوں پر ٹالتا رہے، کیا سماج میں اس کی کوئی ساکھ بن پاتی ہے؟ لوگ اُسے ڈھلمل یقین، کمزور اور بے ریڑھیا سمجھتے ہیں۔ خواہ ایسا شخص کتنا ہی عالم فاضل و دوان ہو کوئی اُسے گردانتا ہی نہیں، نہ کسی اجتماعی کام میں اسے شریک کرتا ہے۔ جب افراد کا یہ حال ہو تو کیا ایسی حکومت کی ذرّہ برابر بھی ساکھ ہوگی جو ٹال مٹول کرتی رہے، فیصلہ سے جی چرائے اور یہ سوچا کرے کہ وقت خود مسائل کو حل کردے گا۔ ایودھیا کے سلسلہ میں ہماری حکومت نے یہی کیا۔ شخصی اور اجتماعی مذاکرات کا جال بچھا دیا گیا۔ گویا مذاکرات سے لوگ تھک جائیں گے تو اپنے موقف میں نرمی لے آئیں گے یا سرے سے ترک ہی کردیں گے، اس طرح یہ سمسیا حل ہوجائے گی۔ ہمارے اربابِ اختیار کو یہ چھوٹی سی بات بھی نہیں معلوم

کہ حکومتیں محکم فیصلوں اور جرأت مندانہ اقدامات اور دلبر قیادت سے چلا کرتی ہیں التوا اور معاملات کو کھٹائی میں ڈالنے سے نہیں چلتیں۔ ہندستان جیسا عظیم اور وسیع اور گوناگوں اور پیچیدہ ملک تقاضا کرتا ہے ایک براق ذہن اور ایک جرأت پیشہ دل اور ایک پیش رفت آمادہ نقطۂ نظر کا۔ گھوڑا سوار کو پہچانتا ہے۔ بھاجپا نے اندازہ لگا لیا تھا کہ سوار میں کتنا دم ہے۔ اس کے گھٹنوں میں کتنی گرفت ہے۔ چنانچہ اوّلین فرصت میں اس نے اسے دے پٹکا اور اس کے ماتھے پر ناتوانی اور بے عملی کا کلنک لگا دیا۔ ہمارے اکابرین اور دانشور مشورہ دینے کے لیے جاتے تھے اور حکمتِ عملی کے قصیدے پڑھ کر چلے آتے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ ابھی تک ہم بادشاہوں اور مہاراجاؤں کے دور میں ہیں اور اس ملک کو جمہوریت کی ہوا بھی نہیں لگی۔ خود کابینہ کا بھی یہی حال ہے وہاں بھی لوگ صدر کا رُخ دیکھتے ہیں، برملا اختلافِ رائے کی جہاں بغاوت سے کی جاتی ہو وہاں مسئلہ کے بیشتر رُخ ڈھکے چھُپے رہتے ہیں، ان پر سے پردہ اُٹھانا جسارتِ بیجا ہے اور اس کا مُرتکب گردن زنی۔ عافیت اسی میں ہے کہ اپنی رائے کو سربراہ کی رائے کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرو۔ وہ بھی خوش تم بھی خوش۔

ایودھیا کانڈ پر جو بیانات نکلے ان میں سب سے درد بھرا بیان صدر جمہوریہ کا تھا۔ سارے اختلاف اور سیاسی مصالح سے بالاتر۔ لگتا تھا کہ دل پر چوٹ لگی ہے۔ ہر لفظ میں درد کی کراہ تھی۔ اتفاق ہے کہ دوسرا قابلِ ذکر واحترام بیان نائب صدر کا تھا جو انھوں نے راجیہ سبھا میں دیا۔ انھوں نے کہا کہ "آزادی کے بعد ملک میں دو بڑے سانحے ہوئے، ایک گاندھی جی کی شہادت، دوسرا بابری مسجد کا شہید ہونا۔" گاندھی کی شہادت نے نفرت اور ظلمت کی اُمڈتی ہوئی فوجوں کو شکست دے کر پیچھے دھکیل دیا تھا، کیا بابری مسجد کی شہادت کا بھی کچھ ایسا ہی اثر ہوگا؟ رجائیت کہتی ہے، ہاں، قنوطیت کہتی ہے، نہیں۔ سوال یہ ہے کہ پشیمانی پوری قوم کو ہے یا چند لیڈروں اور دانشوروں کو۔ فتح اور خوشی کے جشن تو کئی جگہ منائے گئے۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ جن شہروں میں ردِّ عمل نے ہنسا کی شکل اختیار کی وہاں اس کا نقطۂ آغاز فاتحانہ طنز رہا ہوگا۔ لیکن قیاس بھی کیوں کیا جائے۔ یہ بات کم دُکھ کی نہیں کہ ایک دن کے اندر مختلف شہروں میں کم سے کم دو سو انسان خاک وخوں میں تڑپتے نظر آرہے ہیں۔ ان کے گھروں میں ماتم کی صفیں بچھی ہوئی ہیں یہ لوگ خاندانوں کے سربراہ تھے یا ان کے چشم وچراغ۔ ان کے گھر اُجڑ گئے اور بے چراغ ہو گئے۔ نفرت اور عداوت کا جو بیج بھاجپا، وشوہندو پریشد اور آر ایس ایس نے بویا تھا اس کی فصل ہم سب کاٹ رہے ہیں اور نہ جانے کب تک کاٹتے رہیں گے۔

صبح کا بھولا اگر شام کو گھر واپس آجائے تو اُسے بھولا نہیں کہتے۔ ابھی دوردرشن نے بتایا کہ حکومت نے جفا سے توبہ کر لی اور اہم فیصلے کر لیے۔ مسجد اُسی جگہ پر پھر بنائی جائے گی۔ مجرموں کو سزا ملے گی۔ فرقہ پرست پارٹیوں پر قدغن لگے گی۔ مندر کی تعمیر کے بارے میں فیصلہ جلد کیا جائے گا۔ دیکھنا یہ ہے کہ نفاذ کتنی جلد اور کس طرح ہوتا ہے۔

یہ تو سب تمہید ہی تمہید تھی۔ بات جو کہنے کی تھی وہ یہ ہے کہ: مسلمانوں کو چاہیے کہ اس بڑے سانحہ سے عبرت کے تازیانے کا کام لیں۔ اس موقع پر بلکہ گذشتہ ڈیڑھ دو سال سے ان کی قیادت نے ہوش و گوش اور صبر و ضبط سے کام لیا ہے۔ لیکن کچھ کر کے اب بھی نہیں دکھایا۔ جب تک کہ وہ شہر شہر جاکر مسلمانوں کو نظم و نسق کا سبق نہیں دیتی، انھیں یہ نہیں سمجھاتی کہ اچانک مشتعل ہو جانے سے کام نہیں چلتا، نقصان ہی نقصان ہوتا ہے، ہمیں تعمیر اور تنظیم ہی کے لیے خود کو وقف کر دینا چاہیے۔ تعلیم کی طرف سے جو غفلت ہم نے برتی ہے وہ ہمیں بہت مہنگی پڑی ہے، جب تک کہ ہماری قیادت مسلمانوں کو یہ نہیں سمجھاتی کہ ان کی بقا بہ یک وقت مقابلہ اور تعاون، خود نگہداری اور خوش ہمسایگی میں ہے وہ اپنے فرض کو انجام نہیں دے گی۔ ہمیں ہندستان کی زندگی میں ایک نئے باب کا آغاز کرنا ہے۔ شکوے شکایت بہت ہو چکے۔ شکوہ کوئی سُنتا نہیں۔ ہمیں بقائے باہم کے انداز سیکھنے چاہییں اور یہ بات منوا لینی چاہیے کہ "ملک کی پیش رفت اور فلاح میں ہم بڑھ چڑھ کر حصّہ لے رہے ہیں۔ ہندستان کی جیاتی پر ہم بوجھ بن کر نہیں رہنا چاہتے، ہم اس کے دست و بازو ہیں۔ ہم سے ہندستان کی طاقت ہے ہندستان کے لیے ہم سرمایۂ بصیرت ہیں۔ ہندستان ہم سے وسعت نظر اخذ کرتا ہے۔ اس کی اقدار کو ہم نے استوار کیا ہے۔ ہماری نگاہ ملک کے ماضی پر نہیں، اس کے مستقبل پر ہے، ہم ترقی کی شاہراہ پر اہلِ وطن کے ساتھ شانہ بہ شانہ چل رہے ہیں، یہاں کی خوشحالی اور خوش اندیشی میں ہمارا حصّہ ہے۔" یہ ساری باتیں جب تک ہم عمل سے ثابت نہ کردیں اور اہل وطن سے اپنے بارے میں منوا نہ لیں، چین سے نہ بیٹھیں۔

ہمیں اپنے اہلِ وطن کے ساتھ بیٹھ کر بہت سی باتوں کی وضاحت، بہت سے شبہات کا ازالہ کرنا چاہیے۔ ہم اکثریت سے کیا چاہتے ہیں، وہ ہم سے کیا توقع رکھتی ہے، ہماری خواہش اور اس کی توقع کس طرح پوری ہوگی۔ اس کی تکمیل کے لیے عملی اقدامات کیا ہوں گے۔ روزمرّہ کے جھگڑوں کو چھوڑ کر اب ہمیں دوسروں کے ساتھ مل کر ایک روشن مستقبل کی تشکیل کرنی چاہیے خود ہمارے اندر کیا کمیاں، کیا کمزوریاں اور وطن اور اہلِ وطن کے تئیں کیا بے خبریاں ہیں، ہمیں ان کا احتساب کرنا ہوگا، انھیں تسلیم کرنا ہوگا، تاکہ ہم اپنے نقطۂ نظر اور رویّہ کو نئے خوابوں اور نئے مشترک عزائم کے سانچے میں ڈھال سکیں۔ ایودھیا کے بہت بڑے سانحہ نے ملک کو ہلا ڈالا ہے۔ یہ ہمارے ہوش و گوش پر منحصر ہے کہ ہم اس زبردست تخریب سے ایک بڑی تعمیر کا سرو سامان کرسکیں۔ پہلا قدم تو یہی ہوگا، مل کر بیٹھنا، ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھنا اس کی رعایت کرنا، باہمی داد و ستد سے ایک قابلِ عمل رابطہ، رشتہ اور ہمکاری کو وجود میں لانا۔ ہمیں اپنی سمتِ نظر میں انقلاب آفریں تبدیلی کرنی چاہیے۔ مسلمان بچّوں کو نئے ڈھنگ سے اٹھانا چاہیے، انھیں مذہب، انسانیت اور وطن دوستی اور مسئولیت کے سبق پڑھانے چاہییں، ہزار جتن کر کے انھیں جہالت سے چھٹکارا دلانا سب سے زیادہ ضروری ہے۔

ہندستان دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے۔ جمہوریت کی بنیاد انصاف پر رکھی

جاتی ہے۔ ہم سب کو ساری لفظی اور قانونی موشگافیوں سے اوپر اُٹھ کر اپنی صورت حالات، اپنی کیفیت پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ کیا ہم گزشتہ ۴۵ سال کی مدّت میں ایک منصفانہ اور مساوات پر مبنی سماج کو وجود میں لاسکے؟ اگر نہیں تو کیوں؟ کیا ہمارے یہاں اونچی ذاتوں کا تسلط ہنوز قائم ہے؟ کیا آئین کا منشا اور حکومت کی بہت سی فلاحی اسکیمیں ملازمین حکومت کی بے مہری کا شکار ہوجاتی ہیں، کیا اس کا کوئی علاج نہیں؟ کیا وہ خلیج جو سرکار کے قول وفعل کے درمیان خندہ دنداں نما بنی ہوئی ہے۔ اسی طرح چوڑی ہوتی چلی جائے گی۔ کیا یہ بات قرین انصاف ہے کہ ترقی یافتوں اور پسماندوں کو مقابلہ کے میدان میں ایک ساتھ کھڑا کر دیا جائے تاکہ اوّل الذکر کی حرکت تسلسل اور ان کی پیش آغازی انھیں پسماندوں سے اور زیادہ آگے کر دے۔ کیا یہ سب کچھ کر کے ملک کا ضمیر مطمئن ہوسکتا ہے کہ مقابلہ کی آزادی اور روزگار کے مواقع ہر ہندستانی شہری کی دسترس میں ہیں؟ ایسا مقابلہ انصاف پر نہیں، انصاف دشمنی پر مبنی ہے۔ نابرابروں کے درمیان مقابلہ کیسا؟ منڈل کمیشن کی سفارشات منظور کی گئیں تاکہ پسماندوں کے لیے کچھ تلافی مافات ہوسکے تو ایک ہنگامہ اور توڑ پھوڑ کا ایک جشن برپا ہوگیا۔ مسلمان پیچھے رہ گئے ہیں، اپنے ملک کے انتظام میں ان کا عمل دخل برائے نام ہے، پسپائی کی رفتار زور پکڑ رہی ہے انھیں میعاد بستہ ریزرویشن دینے ہوں گے تاکہ ترقی کی دوڑ میں وہ بھی حصّہ لے سکیں۔ اس حادثہ کے بعد اگر عادلانہ سماج قائم نہ ہوا اور اقلیتوں اور کمزوروں کی دستگیری نہ کی گئی تو عداوت، نفرت اور نفاق اسی طرح بنے رہیں گے بلکہ زور پکڑتے رہیں گے۔ یاد رکھیے اگر قوم، نظام اور انتظامیہ کے انصاف پر کسی ایک فرقہ یا جماعت کو بھی اعتماد نہ ہوا تو فتنہ وفساد برابر سر اٹھاتے رہیں گے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ انصاف کے بغیر کسی نظام کو ثبات نہیں ہوتی۔ انصاف کرنا اور اسے ثابت بھی کرنا حکومت اور معاشرہ دونوں کا فرض ہے۔ ساری جماعتوں کو مل بیٹھ کر طے کرنا چاہیے کہ انصاف کو صدر میں کس طرح بٹھایا جائے گا، ہزار ہا سال اور آزادی کے بعد کی ناانصافیوں کو دور کیونکر کیا جائے گا۔ اکثریت اپنے میں جذب ہونے، اپنے گرد طواف کرنے اور دوسروں کے جذبات اور ضروریات کو نظرانداز کرنے کے بجائے اقلیتوں کی تالیفِ قلب کس طرح کرے گی؟

تعلیم کا نصاب کسی قوم کی تشکیل اور اس کے نقطۂ نظر اور سمتِ سفر کے تعین میں کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اُسے نفرت اور تنگ نظری اور بے بصری سے پاک ہوجانا چاہیے اسے اس طرح ڈھالا جائے کہ اعلا اخلاقی اقدار بچپن سے طلبہ کے ذہن نشین ہوجائیں اور وہ عالمگیر انسانیت کے مفادات ومصالح، عزائم اور منصوبوں سے رُوشناس ہوجائیں۔

ان سب امور کو نئی روشنی میں دیکھنا ہوگا۔ ورنہ عداوت کا سارا کاروبار ہمارے پائوں کی بیڑی بن جائے گا اور نصاب اور گھروں اور جلسوں اور اخباروں کے صفحوں میں بوئے ہوئے نفرت اور دشمنی کے بیج نباہی کے برگ وبار لائیں گے۔

یہ مضمون کل مکمل نہیں ہوپایا، آج یعنی ۸ر دسمبر کی خبروں نے امید کی اس مشعل کو

بجھادیا جو تخریب کی راکھ سے تعمیر کو اُٹھتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ پاکستان اور بنگلہ دیش میں مسلمانوں نے مندروں کو جلانا شروع کردیا اور ہندوؤں پر حملے بھی ہونے لگے۔ لندن میں ایک مندر کو جلاکر خاکستر کردیا۔ ایسا لگتا ہے کہ اب یہ آگ برصغیر کے تینوں ملکوں کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔ شری اڈوانی، شری جوشی اور شری سنگھل آج گرفتار کر لیے گئے۔ پوچھے گئے سوال کا جواب شری اڈوانی نے جس انداز سے دیا اس میں پشیمانی شمہ بھر بھی نہ تھی بلکہ سرکشی کے تیور نمایاں تھے۔ انھوں نے ساری خرابی کا ذمہ دار سرکار کو ٹھہرایا۔

سرکار نے کل جو فیصلے کیے تھے شاید وہ انھیں عمل میں نہ لاسکے۔ مسجد کی تعمیر نو اب دشوار نظر آتی ہے۔ آج کی خبر یہ ہے کہ کارسیوکوں نے میدان کارزار چھوڑنے سے پہلے مسجد کی جگہ چبوترہ بناکر اس پر مورتی استھاپت کردی تھی۔ پیراملٹری فورسیز کے بعض جوانوں نے اس چبوترہ کو سمّان دیا اور مورتی کی پوجا کی۔ اب مورتی کو وہاں سے کون ہٹائے گا؟ لوگ پوچھ رہے ہیں کہ کارسیوکوں کو اس کام کی مہلت دی ہی کیوں گئی، انھیں مرکزی حکومت کی نیت پر شبہ ہے۔ انصاف کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ارباب اختیار کی کمزوری اور فیصلہ کرنے میں تاخیر اور کوتاہی ہے۔ ہماری تردّد پیشہ اور تاخیر پیکر مرکزی حکومت ابھی یہ سوچ رہی ہے کہ مسجد کس ادارہ کے ذریعے بنوائی جائے۔ جب تک وہ کسی فیصلہ کو پہنچے گی ملک میں ایک بڑی مہم بھاجپا اور وشو ہندو پریشد مسجد کی تعمیر کے خلاف شروع کردیں گے۔ پاکستان اور بنگلہ دیش میں بابری مسجد کے شہید ہونے کا جو ردّعمل ہوا اور مندروں کی جس طرح بے حرمتی کی گئی یا بے حرمتی کی کوشش ہوئی اور کئی مندر نذر آتش کیے گئے اس نے معاملہ کو اور الجھا دیا ہے اور اس وقت عام بدگمانی اور باہمی عداوت کے ماحول میں اس گتھی کو سلجھانا ممکن نظر نہیں آتا۔

اس مضمون میں مسلم قیادت کے ہوش و گوش کی تعریف کی گئی تھی کہ اس نے عوام کو ضبط کی تلقین کی۔ اب ایسا لگتا ہے کہ عوام تک یا تو یہ پیغام پہنچا ہی نہیں، یا وہ تنگ آکر جنگ پر آمادہ ہوگئے ہیں، اور اب وہ اپنے رہنماؤں کی بات نہیں سنیں گے۔ یہ بات پُرخطر ہے۔ اچھّا ہوتا اگر مسلم رہنما دوردرشن اور آکاش وانی پر مسلم عوام سے مخاطب ہوئے ہوتے اور انھیں ضبط کی تاکید کرتے۔ یہ موقع بھی ہاتھ سے جاتا رہا۔ اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ مسلم رہنما عوام سے کٹے ہوئے ہیں، ان کے اور عوام کے درمیان وہ زندہ رابطہ ہے ہی نہیں جو خدمت اور خیراندیشی اور فلاحی اور ارتقائی کاموں کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے۔ اگر یہ رابطہ قائم نہ ہوا تو پھر عوام انتشار سے دوچار رہیں گے۔ تنظیم کے کام میں تاخیر بہت مہنگی پڑسکتی ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ حالات اب کیا کروٹ لیں گے۔ ایسے میں منظم، متحد اور باخبر اور منسلک رہنما بہت ضروری ہوتا ہے۔

آگ ٹھنڈی جب ہی ہوگی جب انتقام کے چکّر کو توڑا جائے۔ ہمارے مسلم رہنماؤں کو پاکستان اور بنگلہ دیش کے مسلمانوں سے ہاتھ جوڑکر التجا کرنی چاہیے کہ وہ خدارا، اس بنا پر کہ

ہندستان میں بابری مسجد شہید کردی گئی ہے، اپنے یہاں نہ مندروں کو نقصان پہنچائیے نہ ایسے بے گناہ ہندو شہریوں پر حملہ کیجیے۔ ان معصوم انسانوں کا کیا قصور ہے۔ اس کے علاوہ اگر آپ اس طرح بدلہ لیں گے تو ہندستان میں اس وقت جو ہمدردی مظلوم مسلمانوں کے ساتھ عام طور پر پیدا ہوئی ہے اسے عداوت میں بدلتے دیر نہیں لگے گی۔ اپنے ملک کے ہندوؤں اور ہندستان کے مسلمانوں پر رحم کیجیے۔" اگر بی بی سی نیوز سروس سے درخواست کی جائے تو شاید وہ خوشی سے ہمارے دو ایک معروف مسلم رہنماؤں کو پاکستان اور بنگلہ دیش (اور انگلستان) کے مسلمانوں سے خطاب کرنے کا موقع دے دے۔

اس مضمون کے آخر میں راقم سطور اپنی ایک غلطی کا اعتراف کرے گا۔ اس نے آج سے تقریباً سال بھر پہلے تک مسلم قیادت کو یہ مشورہ دیا تھا کہ "بھاجپا کے رہنماؤں کے ساتھ بات کریں اور ان سے پوچھیں کہ وہ مسلمانوں سے چاہتے کیا ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ اس طرح مفاہمت کے باب وا ہو جائیں۔" اسے اب پتا چلا ہے کہ اس کا مشورہ خوش فہمی پر مبنی تھا اور غلط تھا۔ وزیر اعظم نرسمہا راؤ نے دور درشن پر اہل ہند کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ بی جے پی اور وشو ہندو پریشد نے ملک کو دھوکا دیا ہے، اس کے ساتھ عہد شکنی کی ہے جو جماعت اپنے قول سے پھر جائے، جس کے نزدیک حصول مقصد کے لیے ہر طرح کے ذرائع کا استعمال کرنا جائز ہوں، جو نہ اپنے پیمان کا پاس کرے نہ عدالت کے احکام کی تعمیل بظاہر اس سے بات کرکے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ یہ فسطائی طریق کار کی ایک نشانی ہے۔ فسطائی طاقتیں جمہوری روایات اور اخلاقی اقدار کو حقارت کی نظر سے دیکھتی ہیں۔ وہ انھیں اپنے مقصد کی راہ میں ایک پل کے لیے بھی حائل نہیں ہونے دیتیں۔ بھاجپا نے طے کرلیا ہے کہ وہ ہندستان میں ہندو راج استحاپت کرے گی۔ ایسا کرنے کے لیے وہ کہیں رُکے گی نہیں۔ انصاف کے تقاضے اور جمہوریت کے آداب اس کے سدّ راہ نہیں بن پائیں گے۔ جس پارٹی کا سیاسی فلسفہ کدورت، عداوت اور تنگ نظری سے پھوٹتا ہو وہ رواداری اور انصاف کی بات سُنے گی ہی کیوں؟۔ لیکن راقم پھر بھی اتنا کہے گا کہ موقع پڑے تو اس سے گفتگو ضرور کی جاسکتی ہے، اس کے عہد و پیمان پر اعتبار کیے بغیر۔ ممکن ہے کہ خود اس کے مصالح اسے کسی وقت ہماری بات پر غور کرنے کے لیے مجبور کردیں۔ حالات اس قدر تیزی سے بدل رہے ہیں کہ لائحہ عمل اور نقطہ نظر ابھی مرتب نہیں کیا جاسکتا۔ اس وقت ضرورت ہے حزم و احتیاط، اور نظم و ضبط کی، عوام سے روابط استوار کرنے کی، انھیں اشتعال کے خلاف آگاہ کرنے کی، انھیں خاموشی، سنجیدگی اور صلح کوشی کے ساتھ اپنی اپنی بستیوں میں دفاع کے لیے تیار کرنے کی۔ اتنا ہی اہم ہے سیکولر اور انصاف پسند سیاسی پارٹیوں کے ساتھ سمجھوتہ کرنا۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کے قدرتی یاور اور ہمدرد ساری اقلیتیں، درج فہرست ذاتیں اور قبائل اور دوسرے پسماندہ اور کمزور طبقات ہیں۔ ان کے ساتھ عہد وفا باندھنا چاہیے۔ الغرض ہمارے رہنماؤں کو نئے پس منظر میں ان سارے مسائل پر غور کرنا اور مسلمانوں کی حفاظت

12 ۲۲۴

ان کے استحکام اور فلاح و ترقّی کی کوشش کرنا ہوگا۔

بہر حال مسلمانوں کو ضعیفی کے جُرم اور بدنظمی کے گناہ کی سزا مل گئی۔ وہ ملنا ہی تھی، اور غافل رہیں وہ اپنے مفادات اور مصالح سے اور جھگڑتے رہیں وہ اسی طرح بے مصرف اور نا اہم باتوں پر، اور بے خبر رہیں وہ بدخواہوں کی چالوں اور ارادوں سے۔

مسلمانوں کے خیرخواہ ان کی تالیفِ قلب کے لیے اور اربابِ اختیار کھسیان پن مٹانے اور عالمی رُسوائی کے داغ کو دھونے کے لیے اعلان کر رہے ہیں کہ بابری مسجد نئے سرے سے تعمیر کرائی جائے گی۔ یہ کوئی بھی نہیں بتاتا کہاں اور کب اور کس وضع پر۔ تعمیر نو کا مفہوم تو یہ ہوا کہ جس جگہ اسے توڑا گیا ٹھیک وہیں بنائی جائے گی۔ کیا یہ ممکن ہے؟ کیا مرکزی حکومت کی کچھوا چال نے اس جگہ جو چبوترہ بنوادیا اور جو مورتی وہاں رکھوادی، کیا اس کا ارادہ ایک کو تڑوانے اور دوسری کو ہٹوانے کا ہے۔ کیا اس بے ریڑھ حکومت میں اتنا دم ہے کہ وہ ایسا کرسکے تھوڑی دیر کے لیے مان لیجیے۔ کہ سرکار کے پھیپھڑوں میں آکسیجن بھر دی گئی اور اس نے یہ فیصلہ کر بھی لیا تو بھی کیا اس طرح مُلک گیر فتنہ و فساد کا ایک نیا دروازہ نہ کھل جائے گا؟ کچھ لوگ یہ کہتے ہوئے بھی سنائی دیے کہ انہدام کے اثرات کو مٹانے کے لیے اور سابقہ کیفیت کو بحال کرنے کے لیے مسجد اسی جگہ پر بنے گی اور جب وہ بن جائے گی تو اس میں مورتی اسی طرح سے رکھ دی جائے گی جیسے وہ انہدام سے پہلے رکھی ہوئی تھی۔ سبحان اللہ! قیامت رفتہ کو آواز دینے کی اس سے انوکھی مثال، عمل درکنار، تخیّل کی گرفت میں نہیں آسکتی۔ مسلمان ایک بل سے کتنی بار ڈسا جائے گا۔ اگر ایسا کیا گیا تو بھارت اُس طویل اور المناک جھگڑے کا ری پلے، دیکھے گا جس کی نمائش کی ذمّے دار ایک بار پھر بھارت سرکار ہوگی۔ تکنیکی نقطۂ نظر سے دیکھیے تو "ری پلے" میں کیا مضائقہ ہے، ریہرسل تو پہلے ہی (۵ دسمبر کو قریب ہی ایک جگہ پر) کارسیوکوں نے بڑے ذوق و شوق کے ساتھ کیا تھا اور بھارت سرکار کو اس کی کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ لوگ اب بھی اس کی سلامتی ہوش و حواس کی بات کرتے ہیں۔ حکومت کی ایوان ایک ستون باخبری ہے اور یہاں یہ ستون سرے سے غائب"!

ایک تجویز یہ بھی سُننے میں آرہی ہے کہ مسجد قریب ہی کسی دوسری جگہ بنادی جائے نمک پاشی کی یہ نئی ترکیب نکالی گئی۔ کیا اس پُرانی تجویز کو مسلمان اب اس لیے قبول کرلیں گے کہ اس اثنا میں وہ خاک و خوں اور دُخان و آتش سے گزر چکے ہیں:

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا　　　کریدتے ہو جب اب راکھ جستجو کیا ہے

ہمدردوں اور بے دردوں سے مسلمان یہی کہیں گے کہ خدارا اب ان کے زخموں کو نہ کُریدیں مسجد بنانا چاہیں بنائیں، نہ بنانا چاہیں نہ بنائیں، بنانا چاہیں تو جس جگہ بنانا چاہیں بناڈالیں۔ مسلمان بھر پائے انھیں اب اس قضیہ میں نہ اُلجھائیں، ان کے زخموں کو نہ کُریدیں۔ ہماری جمہوریت میں اقلیت ہونا سب سے بڑا پاپ ہے۔ اس پاپ کی سزا انھیں کب تک دی جائے گی، سزا کی بھی تو کوئی میعاد ہوتی ہے۔ جس عداوت اور نفرت کے چہرے سے نقاب

اس تزک و احتشام کے ساتھ اُٹھا دی گئی اب وہ سات پردوں کے پیچھے چلی جائے تو بھی نگاہوں کو دھوکا نہ دے سکے گی۔ وہ کروڑوں کدورت پیشہ دل جنھیں گھٹا ٹوپ اندھیروں نے گھیر لیا ہے روشنی کی کرنوں کو آیندہ برداشت کیسے کر سکیں گے۔ بابری مسجد کی شہادت سے مظلوموں کے دل ٹوٹ گئے، یہ بہت بڑا نقصان ہے کیونکہ دل زندہ پر ہی حوصلہ اور اعتماد کا انحصار ہوتا ہے، ہمارے آنسو ریجھ جائے اگر جہاں دل ٹوٹے ہیں وہاں آنکھیں کھل جائیں، وہ دوست اور دشمن، عارضی اور دائمی، حقیقی اور سیاسی میں فرق کرنے لگتے۔

آپ نے دیکھا جہاں ایک کے علاوہ ساری سیاسی پارٹیاں مسجد کی حفاظت کے حق میں تھیں اور زیادہ تر اہلِ علم و دانش ان کے ہمنوا تھے، وہاں پھر بھی مسجد محفوظ نہ رہ سکی۔ اس سے نتیجہ کیا نکلا۔ یہ پارٹیاں اور یہ اہلِ دانش عوام کی اکثریت کے ترجمان نہیں ہیں۔ اگر ہوتے تو یہ سانحہ نہ ہوتا۔ ہمیں ہندو عوام کے پاس جانا پڑے گا، ابھی نہیں کہ اس وقت اس کا غلط مفہوم لگایا جائے گا۔ جب نفرت کی آگ ٹھنڈی ہونے لگے تو ہمیں ان کے سامنے دودھ کا دودھ، پانی کا پانی الگ کر کے رکھنا ہوگا۔ فاصلہ سے بدگمانیاں دن دونی رات چوگنی بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ کیوں نہ ہم عہد کرلیں کہ ہم فاصلہ کو حائل نہ ہونے دیں گے لیکن "ہم" سے مراد کیا ہے، ہماری نمایندگی کون انجام دے گا، ہماری طرف سے عہد کون کرے گا، جہاں تنظیم نہ ہو، اتحاد نہ ہو، اعتماد نہ ہو وہاں ترجمانی کون کرسکتا ہے، وہاں اہلِ وطن ہماری بات کیوں سُننے لگے۔ جنھیں وہ حقارت سے دیکھتے ہیں ان کی بات کو وہ وزن کیوں دینے لگے۔

بہرحال اگر ہمیں زندہ رہنا ہے، عزّتِ نفس کے ساتھ، سر اٹھا کر، سینہ تان کر، بالا قدمی کے ساتھ تو ہمیں اپنا گھر پہلے درست کرنا پڑے گا۔ جس گھر سے آئے دن جھگڑے، مار پیٹ، اور الزام و دشنام کی صدائیں آتی ہوں ہمسایے اس گھر کے مکینوں کو منہ نہیں لگاتے۔ اب ہم سے یہ اطمینان چھین لیا گیا ہے کہ سیکولر جمہوریت ہیں، وقتی حادثوں سے قطعِ نظر، ہم امن چین سے رہ پائیں گے۔ اب تو ہمیں نگرانی، چوکسی اور نگہبانی کا طریقہ اپنانا پڑے گا۔ غنیم گھات میں ہو تو ایک لمحہ کی غفلت گھاتک بن جاتی ہے۔ ہم کسی کو غنیم نہیں سمجھتے تاوقتیکہ وہ اپنے برتاو سے یہ ثابت نہ کر دے۔ ہماری حالت ہے کیا۔ ایک ادارہ بھی ہم ڈھنگ سے نہیں چلا پاتے۔ ہمارے اداروں اور انجمنوں میں خانہ جنگی کا سکّہ چلتا ہے، ہم کو مسلمانوں کی خامیوں اور ان کے فرائض کا احساس ہے لیکن اسی وقت تک جب کہ ہم خود کو مستثنا کر دیں۔ ہم اپنی ذات کو ملّت کے مفاد سے بالاتر، کہیں بالاتر سمجھتے ہیں۔ مسلکوں کی لڑائیاں ہم ہی میں ہوتی ہیں۔ عیب اور بہتان کا کاروبار ہمارے ہاتھوں فروغ پاتا ہے۔ جہالت ہماری رفیقِ راہ بن گئی ہے۔ وقت ضائع کرنا ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ پھر ہم ترقی کریں تو کیوں کر۔

وقت آگیا ہے کہ ہمارے بڑے مل بیٹھیں اور باہمی مشورہ کے بعد سمتِ نظر اور سمتِ سفر دونوں متعیّن کر دیں۔ اقلیّت کی صورتِ حالات کی منطق یہ ہے کہ وہ اکثریت سے بہت زیادہ محنت کر کے مہارت، فضیلت اور امتیاز حاصل کرے۔ ہندستان میں جہاں اکثریت

اقلیتوں اور پسماندوں کے استحصال کو ایک فنِ لطیف کی طرح برتتی چلی آئی ہے، اس بات کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اکثریت کے ایک طبقہ نے اس وقت کھل کر جو حملہ ہم پر کیا ہے اس میں سے ہمارے لیے بھلائی کی راہ نکلتی ہو۔ ہمیں خطرہ کا پہلی بار سچّا احساس ہوجائے اور ہم اس کے لیے ڈھال وضع کرلیں۔

اس اثنا میں ہمارے وزیراعظم نے اپنے اعلان کے ایفا کی کوشش کی ہے۔ پارٹیوں پر جو قدغن لگائی ہے اس میں سے نکلنے کے لیے چور دروازے بہت ہیں، خصوصاً ایسی پارٹیوں کے لیے جو تنظیم کی لڑی میں پروئی ہوئی ہوں، اور ایسی حکومت کے زیرِ سایہ جو خوش خرام اور نرم لجام اور کمزور ہو۔ یہ بات البتّہ انوکھی ہے کہ جب کوئی تادیبی کارروائی کی جاتی ہے تو مسلمانوں کو ان کا حق حصّہ امیدی سے کچھ زیادہ ہی ملتا ہے۔ چنانچہ ہندوؤں کی تین پارٹیوں کو ممنوع قرار دیا گیا تو مسلمانوں کی دو پارٹیوں کو بھی زیرِ قدغن لے آئے۔ اسلامک سیوک سنگھ کو بند کرنے کا تو جواز تھا، لیکن جماعت اسلامی نے کیا قصور کیا تھا۔ تعلیم، اخلاقی رہنمائی اور راحت رسانی کے علاوہ یہ بچارے کرتے ہی کیا ہیں۔ آندھرا پردیش میں سائیکلون آیا تو جماعت نے بغیر امتیازِ مذہب راحت رسانی کا کام بڑی جانفشانی اور سلیقہ سے انجام دیا جس کا اعتراف متعلّقہ حُکّام نے بھی کیا۔ ان کا قصور صرف یہ ہے کہ وہ ایک پاکستانی اور ایک کشمیری انجمن کے ہمنام ہیں اور ان انجمنوں کا طرزِ عمل جارحانہ رہا ہے۔ یہ فیصلہ نظرِ ثانی کا مستحق ہے۔

جو کام فوراً انجام دینا ہے وہ ہے ریلیف یا راحت رسانی کا کام۔ یہ کام بھی تنظیم چاہتا ہے۔ پھر مظلوموں کی فریاد سُننا ان کی بات اہلِ اقتدار تک پُہنچانا، ان کی داد رسی کرنا۔ ان کے زخموں پر پھائے رکھنا، پولیس اور آرمڈ پولیس کی زیادتیوں کو دستاویزی روپ میں پیش کرنا۔ اب کے تو فسادات مُلک گیر ہو گئے ورنہ کچھ شہر ایسے ہیں جو ہر وقت فساد آمادہ رہتے ہیں۔ وہاں بلوؤں سے نبرد آزما ہونے کے لیے منصوبے تیار رہنے چاہییں۔ اگر فسادات ہمارا مقدّر بن گئے ہیں تو ہمیں اپنے مقدّر کا پاس رکھنا چاہیے۔ ہمّت اور تنظیم کے ساتھ مقسوم کی پذیرائی کرنی چاہیے۔ دوستی اور محبّت کا ہاتھ ہم برابر بڑھائیں لیکن ہر بار احتیاط کے ساتھ، اعتماد کے ساتھ اور طاقت کے ساتھ۔ رفاقت، دوستی، تعاوُن، خیر اندیشی، بجا اور برحق، مسکینی، سپر اندازی، نیاز مندی، سرنگوئی، بے جا اور باطل مظلوموں کی مدد اس طرح کیجیے کہ جو لوگ آگے آجائیں وہ زیادہ پاجائیں اور جن لوگوں کی غیرت اور تامّل انھیں آگے نہ بڑھنے دے وہ محروم رہ جائیں۔ ریلیف یا راحت رسانی کے کام میں جو مجلس ماتم میں کیا جارہا ہے بزمِ مے کا سا سماں نہ ہونا چاہیے "یہ بزمِ مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی۔ جو خود بڑھ کر اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے"۔ یہ بھی نہ ہو کہ بعض ظلم رسیدوں پر بہ یک وقت کئی امدادی انجمنوں کی نظرِ التفات پڑے، اور دوسروں تک کوئی پہنچنے نہ پائے۔ مناسب ڈھنگ تو یہ ہوگا کہ ہر آفت زدہ شہر میں تقسیم کا کام صرف ایک ایجنسی یا ادارہ کرے۔ یہ اعلان کرنا اس کی

اخلاقی اور ضابطہ کی ذمّہ داری ہوگی کہ ان اداروں، انجمنوں یا ایجنسیوں کے ناموں کا شہر یا قصبہ یا گاؤں میں اعلان کردے جنھوں نے وہاں کے لیے روپیا اور اشیا، فراہم کی ہیں اور فراہمی کی مقدار بھی کھول کر بیان کر دی جائے۔ مسلمان جن میں غیرتِ ملّی اور انسانی ہمدردی زندہ ہے ایسے موقعوں پر دل کھول کر مدد کرتے ہیں۔ جب تک برباد شدہ لوگ نئے سرے سے آباد نہیں ہوتے ان کے لیے کھانے بھیجے جاتے ہیں! یہاں بھی تال میل اور احتیاط ضروری ہے تاکہ رزق ضائع نہ ہو۔

امداد کی رقوم کا ایک اچھّا مصرف باز آبادکاری ہے۔ مکان پھر سے بنائے جائیں، مکانوں اور دکانوں میں سامانِ رہائش اور سامانِ تجارت پہنچایا جائے۔ زخمیوں کا علاج اور بیواؤں اور یتیموں کے لیے پرورش کا مستقل انتظام، یہ سب خصوصی توجہ چاہتے ہیں۔ ان کے لیے معقول اقدامات ضروری ہیں۔ یتیم بچّوں کی تعلیم کو راحت رسانی کے کام میں ترجیح دینی چاہیے۔

اگر ایک محلہ میں ہندو اور مسلمان دونوں مجروح ہوئے ہیں تو ہماری ریلیف پارٹیوں کو امداد کرتے ہوئے مذہب کی بنا پر کوئی امتیاز نہ کرنا چاہیے۔ ہمارے دل انسانیت اور انصاف کا جو خون ہوا ہے اُس پر دُکھے ہیں۔ علاوہ بریں ہمیں جلے ہوئے مکانوں کی راکھ سے ایک ایسے عمارت کو تعمیر کرنا ہے جو بھید بھاؤ سے بالاتر ہو۔

تازہ ترین اطلاعات بتا رہی ہیں کہ شہید صرف بابری مسجد کو نہیں کیا گیا۔ دیپ آشیش مکرجی نے ۶ دسمبر کو جو کچھ دیکھا اس کی رپورٹ انھوں نے ایودھیا سے روانہ کی۔ اس کا ترجمہ قومی آواز نے ۱۵ دسمبر کے شمارہ میں شائع کیا ہے۔ اس کو پڑھ کر آنکھیں اور کھُل گئیں۔ ایودھیا شہر کی دوسری مسجدیں بھی نذرِ آتش کر دی گئیں اور چُن چُن کر مسلمانوں کے مکان جن کی آبادی پانچ ہزار تھی جلا دیے گئے۔ شریمتی بلکہ سادھوی اوما بھارتی نے اُس وقت جو تقریر کی اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آتش زنی اور قتل و غارت کی یہ ساری کارروائی سوچے سمجھے منصوبے کے تابع تھی۔ کیا ایودھیا کی دوسری مسجدیں بھی، جن کی تعداد تیس کے لگ بھگ ہے، رام جنم بھومی پر مندروں کو توڑ کر بنائی گئی تھیں؟ اسی رپورٹ میں ایک اور حادثہ کا ذکر بھی ہے جس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اگر بھاجپا اختیار میں آگئی، اگر اس نے زمامِ اقتدار ہاتھوں میں لے لی تو وہ مسلمانوں سے کیا مطالبہ کرے گی، کیا چاہے گی۔ بھاجپا کا رُکن بن جانا یا اس کے سیاسی مسلک کا اتباع کرنا، یا اس کی قصیدہ سرائی کرنا کافی نہیں ہوگا۔ اس کی مانگ صرف یہ ہوگی کہ اپنی شناخت بھول جاؤ، اپنے مذہب کو ترک کردو اور ہندوتّیت کے رنگ میں خود کو رنگ لو، ورنہ تم پر جو بیتے گی اس کے ذمہ دار تم ہی ہوگے۔ قارئین احسن حیدر پر جو بیتی اس سے اندازہ لگالیں۔ دیپ آشیش لکھتے ہیں "وہ (حسن حیدر) بھی ایودھیا میں بڑی آراضی کے مالکوں میں شامل ہیں، ہندوؤں سے ان کے بہت قریبی تعلقات رہے ہیں انھوں نے اپنی آراضیوں پر بہت سے بے گھر ہندوؤں کو آباد کیا ہے، ایک شخص نے یہ

بھی بتایا کہ مسٹر حسن حیدر بھارتیہ جنتا پارٹی ایودھیا کے صدر رہ چکے تھے اور یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ پوری طرح محفوظ ہیں کسی بھی طرح کا تحفظ حاصل کرنے سے (انھوں نے) انکار کر دیا تھا لیکن آج صبح کار سیوکوں کے ایک جتھے نے ان کے گھر میں گھس کر لاٹھیوں سے ان کی پٹائی کر کے اس حال کو پہنچا دیا ...... حاجی محبوب نے اپنے ہی علاقے کے چھے افراد کے نام بتائے جنھیں ۶ دسمبر کی شام کو تباہ اور تاراج کرنے والے ہجوموں نے ہلاک کر دیا تھا۔" ایک سو آدمیوں نے تھانے میں پناہ لی تھی.... ہر چند کہ ایودھیا کے مسلمانوں کے تعلقات مقامی ہندوؤں سے بہت اچھے تھے مسلمانوں کے مکانوں کی نشاندہی تو مقامی ہندوؤں نے ہی کی ہوگی۔

آج (۱۶ دسمبر) کی اطلاعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرکزی سرکار نے اب مضبوط قدم اٹھانے کی ٹھان لی ہے۔ تینوں بچی ہوئی ریاستوں کی بھاجپائی حکومتوں کو برطرف کر دیا گیا ہے۔ سیکولر پارٹیوں اور خود کانگریس کے سیکولر عناصر کا دباو اکارت نہیں ہوا۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ سیکولر عناصر کی مدد کریں اور سارے صحت مند اقدامات میں حکومت کا ساتھ دیں۔ تھوڑی دیر کے لیے ہم بھول جائیں کہ حکومت نے کیا نہیں کیا۔ اس وقت دھیان صرف اس طرف دیں کہ سرکار کیا کرنے جا رہی ہے۔ اس کا ہاتھ بٹائیں۔ اس نے جو غلطیاں کیں اس کی مذمت نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ ان سے کہیں زیادہ ہمارے روشن خیال ہندو بھائیوں نے کر لی۔ اب وہ بعد از خرابی بسیار راہِ راست پر آئی ہے۔ ہمیں اس کی منزل کو آسان کرنا چاہیے اس گئی گزری حالت میں بھی ہندستان میں ایسے ہندو نظر آتے ہیں جو بھید بھاؤ سے بہت اوپر اُٹھ کر انسان دوستی، مسلماں پسندی اور وطن پرستی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُنھیں جزائے خیر دے اور ان کے ہاتھوں اور ارادوں کو مضبوط کرے۔ اسٹیٹسمین میں حال ہی میں دو لڑکیوں ورشا وینکٹیسن اور پونم کا ۱۲ دسمبر کا خط مسٹر اڈوانی کے نام چھپا ہے جسے اڈیٹر نے سُرخی دی ہے کہ "ہندستان کے مستقبل کی آواز سُنیے" اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری نئی نسل کے بعض بچّے اور بچّیاں تعصّب کے زہر سے بفضلہ تعالیٰ محفوظ ہیں وہ ایک ایسے بھارت کے خواب دیکھ رہے ہیں جو نفرت اور عداوت سے پاک ہو۔ نئی نسل کے ایسے نونہالوں سے ہماری امیدیں وابستہ ہیں۔ لیکن ہمیں بھول کر بھی مستقبل کی طرف سے مطمئن نہ ہونا چاہیے۔ ہندستان اگر بے تعصّب اور روشن خیال اور سلامت رو اور انسان دوست رہتا ہے تو اس میں فائدہ سب سے زیادہ مسلمانوں کا ہے۔ اس لیے ایسے بھارت کی تعمیر میں ان کا یوگدان بھی سب سے زیادہ ہونا چاہیے۔

مسلمان کسی شمار و قطار میں نہیں

ہندستان میں کسی طبقہ کے ساتھ اتنی غفلت نہیں برتی جاتی جتنی مسلمانوں کے ساتھ۔ سیاست اور حکومت دونوں جانتی ہیں کہ مسلمان سادہ لوح ہیں، جذباتی ہیں، اپنے بھلے برُے کی ان کو تمیز نہیں، یہ کوئی رائے عامّہ نہیں رکھتے یا انھیں کھلونے دے کر بہلایا بھی جا سکتا ہے، لڑایا بھی جا سکتا ہے یا ان کی لڑائی کی لَے کو تیز کیا جا سکتا ہے۔ پچھلے تیس سالوں پر نظر ڈالیے۔ اردو کے بارے میں مسلمانوں کو کتنا تڑپایا اور ترسایا گیا (اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے لیکن تڑپنے اور ترسنے والوں میں وہ پیش پیش رہے ہیں)۔ گجرال کمیٹی کی رپورٹ آئے ہوئے ۱۹ سال ہو گئے۔ اس کمیٹی پر سرکار نے دو کمیٹیاں (آل احمد سرور، علی سردار جعفری کمیٹی) اور بٹھائیں اور فیصلہ نام کی کوئی شے منظرِ عام پر نہیں آئی۔ دوسرا کھلونا علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کا اقلیتی کردار تھا۔ ۱۵ سال اس کی تلاش اور طلب میں ضائع ہوئے، معیار اور نظم و ضبط کو اس اثنا میں زبردست جراحت پہنچی۔ ملا کیا؟ جو کچھ ملا اس کے نتائج مثبت کم نکلے، منفی زیادہ۔ اصحابِ اقتدار اور اربابِ سیاست سے کوئی پوچھے کہ تاریخی کردار کے نام پر علی گڑھ کو جو کچھ دیا وہ ۸۱ء کے بجائے ۶۵ء-۶۶ء میں بھی دیا جا سکتا تھا۔ پندرہ سال تک ایک پوری ملت کی یکسوئی اور تعلیم و تنظیم و تعمیر کو برہم کیوں کیا گیا؟ اردو کو جو کچھ دینا تھا وہ اس وقت بھی دیا جا سکتا تھا جب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے ۲۲ لاکھ دستخطوں سے ایک محضر پیش کیا تھا۔ لیکن دینا ہی کب تھا۔ البتّہ اردو والوں کو رُلانا، تڑپانا، یا انھیں خود اپنی نگاہوں میں گرانا اور اردو سے برگشتہ اور بے تعلق کرنا مقصود تھا۔ سو یہ کام تو خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دے دیا گیا۔ اس اندیشہ سے کہ مبادا مسلمان پڑھنے لکھنے اور تعمیری کاموں میں نہ لگ جائیں، بابری مسجد، رام جنم بھومی نزاع کو جو عرصہ سے مقفّل اور سربمہر تھا، سرد پڑ چکا تھا، پھر سے زندہ اور گرم کر دیا گیا، کھول دیا گیا۔ مسلمانوں کی جانیں تو علی گڑھ اور اردو کے قضیوں نے بھی لیں لیکن رام جنم بھومی اور رتھ یاترا نے تو بعض جگہ ان کے قتلِ عام کی شکل اختیار کر لی۔ رہی سہی یکسوئی تمام ہوئی اور پڑھنے لکھنے کا ابھرتا ہوا شوق خاکستر ہو گیا۔ عائلی قانون یا پرسنل لا کا مسئلہ یا

یکساں سول کوڈ کا خطرہ ایک عرصہ سے ان کی طمانیت کو برہم کرتا رہا ہے۔

ہمارے اہلِ وطن کا ایک طبقہ جس کی نمایندگی بھاجپا کر رہی ہے کہتا چلا آرہا ہے ساری شہادتوں، حقیقتوں اور قرائن کے خلاف، کہ ہندستان میں مسلمانوں کا لاڈ کیا جارہا ہے، ان کی ناز برداری ہو رہی ہے، انھیں طرح طرح کی مراعات دی جاتی ہیں۔ کوئی بی جے پی کے ان ہوشمندوں سے پوچھے کہ مسلمانوں کا آزادی کے بعد جو حال اس ملک میں ہوا ہے کیا وہ ان "امتیازات" کا نتیجہ ہے جو ان کے "حق" میں کیے جاتے رہے ہیں۔ حقیقت دراصل یہ ہے کہ جو اعلان مسلمانوں کے حق میں کیے جاتے ہیں وہ عملی جامہ کے لیے ترستے رہتے ہیں۔ نئی تعلیمی پالیسی۔ ۸۶ء کے عملی پروگرام میں ایک پورا باب اقلیتوں کی تعلیم کے بارے میں تھا۔ حال ہی میں سرکار کی قایم کی ہوئی ایک کمیٹی نے اس کا جائزہ لیا تو پتا چلا کہ اس پر سرے سے عمل ہوا ہی نہیں۔ یہی حال مسز گاندھی کے پندرہ نکاتی پروگرام کے بیشتر نکات کا ہوا۔ اور مسلمان خوش ہوگئے کہ ان کے حق میں فرامین جاری تو ہوئے۔ وہ زود پشیماں پشیماں تو ہوا۔

ہمارے نزدیک ڈاکٹر امبیڈکر اور مولانا آزاد دونوں محترم اور مخدوم ہیں۔ ان دونوں بڑے رہنماؤں کی ولادت صدی گزشتہ دو تین سال کے اندر منائی گئی۔ مولانا آزاد کے سلسلہ میں چند سیمینار ہو گئے جنھوں نے "آزادیات" میں کوئی قابل قدر اضافہ نہیں کیا۔ ایک کام البتہ ایسا ہوا جس میں تعمیر کا پہلو نکلنا تھا۔ سنٹرل وقف کونسل کے ایما سے مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن قائم ہوئی۔ طے ہوا کہ اسے دس لاکھ روپے سنٹرل وقف کونسل دے گی اور پانچ کروڑ روپے حکومت۔ یہ بھی منصوبہ بنایا گیا کہ وہ عمارت جو ذاکر حسین کالج، دہلی نے خالی کی ہے فاؤنڈیشن کے سپرد کی جائے گی تاکہ وہ وہاں لڑکیوں کی صنعتی تربیت کے لیے ایک پولی ٹیکنک کھولے۔ فاؤنڈیشن تقاضے در تقاضے کر رہی ہے۔ کشکول لے کر وزارت فلاح کے دروازے پر دستک پر دستک دے رہی ہے۔ ایک عرصہ تک وہاں یہ سوال زیرِ غور رہا کہ یہ "زرِ خطیر" صرف کس طرح کیا جائے۔ پھر اس رائے نے کچھ دنوں کے لیے زور پکڑا کہ کسی ایک فرقہ کے لیے روپیا دے دیا گیا تو دستورِ ہند کا خون ہو جائے گا۔ اور اب یہ کہا جا رہا ہے کہ پلاننگ کمیشن ہامی نہیں بھر رہا۔۔۔۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ کسی دریدہ دہن نے دوردرشن پر "شو بوائے" کے بارے میں سوال کر لیا تو ایوان میں اور اس کے باہر ایک شور مچ گیا کہ مولانا آزاد کی بے حرمتی ہوگئی۔ اس میں کیا کلام کہ بے حرمتی ضرور ہوئی۔ لیکن جس طرح سے گزشتہ تین سال میں مولانا آزاد کے نام پر جو فاؤنڈیشن قائم کی گئی اسے پیسہ پیسہ کو محتاج کیا جا رہا ہے۔ اس سے کیا مولانا ابوالکلام آزاد کی عزت افزائی ہو رہی ہے؟ راقم سطور کی نگاہ میں یہ اس سے بڑی اہانت ہے جو دوردرشن کے ہاتھوں سرزد ہوئی تھی۔ وہاں تو غفلت اور جسارت ایک فرد کی تھی یہاں یہ توہین ساری متعلقہ

وزارتوں کی طرف سے عمل میں آرہی ہے اور اعتذار اور انفعال درکنار کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی۔

اس کے برعکس ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر کے صدی جشن کا رُخ شروع سے آخر تک فلاحی اور تعمیری رہا ہے اور حکومتوں نے بھی اس میں ڈاکٹر صاحب کے شایان شان حصّہ لیا ہے وہ کام جو اس صدی جشن کے سایہ میں انجام پا رہے ہیں، وہ غالباً ہندستان بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر بی آر امبیڈکر یونی ورسٹی کے پروجیکٹ کو لیجیے جو لکھنؤ میں کھولی جائے گی۔ اس پر ۳۰۰ کروڑ کی لاگت آئے گی یعنی اس رقم کی ساٹھ گنا جو مولانا آزاد فاؤنڈیشن کے لیے دریغ کی گئی۔ اس میں جدید ترین مضامین کی تحقیق اور تدریس ہوگی۔ میٹریل سائینز، بایو سائینز۔ خلا کے سائینز۔ انسٹرومینٹیشن اور ڈیزائن انجینیرنگ اور فارما سیوٹکل سائینز وغیرہ۔

آپ کو اندازہ ہوا کہ مسلمانوں کی اب ان کے ملک میں اوقات کیا رہ گئی ہے۔؟ اس کی وجہ؟ باخبر رائے عامہ سے محرومی اور نااتفاقی اور خانہ جنگی اور ملی اور اجتماعی امور سے افراد اور رہنماؤں کی بے تعلقی اور خود غرضی اور بِک جانے کے لیے ہمہ وقت تیاری۔ اس پر مستزاد احساس تناسب کی وہ کمی جو اہم اور غیر اہم کو الگ الگ نہیں رکھ سکتی۔ مولانا آزاد کے لیے کچھ بھی نہیں ہوا اور ڈاکٹر امبیڈکر کے لیے سب کچھ ہوا اور ہو رہا ہے (ہم آخر الذکر پر خوش ہیں اور اوّل الذکر پر ملول) اس کا سبب تلاش کرنے کی آپ نے کبھی کوشش کی۔ ہمارے شیڈولڈ کاسٹ (درجِ فہرست طبقات) بھائی منظم اور متحد ہیں، ہوش و گوش اور آگے بڑھنے کا ولولہ اور ایک دوسرے کو آگے بڑھانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ ہمارے یہاں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ ترقی آمادہ ہیں اور ہم انحطاط پذیر فتنہ ـــ ہمارے افراد کو اپنی خوشحالی، ہمارے رہنماؤں کو اپنی رہنمائی کی فکر سدا دامن گیر رہتی ہے۔ انھیں اس کی فرصت کہاں کہ مسلمانوں کے اہم ترین مسایل کو سمجھیں اور حکومت کو مجبور کریں کہ مسلمانوں کی سُنے اور منظور کرے۔

یہ بھی آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہماری سیاسی پارٹیاں ان خطاؤں کا کفارہ جو مسلمانوں کے دوررس مفاد سے غفلت کر کے انھوں نے کی ہیں، کس طرح ادا کرتی ہیں۔ کبھی عید میلاد النبیؐ کی چھٹی کا اعلان کر کے، کبھی اردو زبان کے حق میں دلخوش کن بیان جاری کر کے، کبھی پندرہ نکاتی پروگرام اور کبھی عملی پروگرام۔ ۱۹۸۶ء کی جا بجا تشہیر کر کے۔ ہماری حالت بھکاریوں کی سی ہے، ایک دن ایک ٹکڑا ڈال دیا تو دوسرے دن کی کوئی فکر نہیں۔ شری ملائم سنگھ یادو نے اعلان کر دیا کہ وہ بابری مسجد کی حفاظت کریں گے۔ اردو والے جن میں بیشتر مسلمان ہیں خوش ہو گئے چنانچہ جب ان کے اس "محسن" نے سرکاری زبان کے متعلق اردو کی نسبت سے پچھلی حکومت کے اعلان کو منجمد کر دیا تو کسی اردو والے نے صدائے احتجاج بلند نہیں کی۔" ہم ایسے محسن کی راہ میں کانٹے کیوں بوئیں۔ یہاں لالے مذہب کے پڑے

ہوئے ہیں، ایسے میں زبان کی فکر کون کرے،" گویا ہمیں ایک حق دے دیا جائے تو سرکار کو اختیار ہے کہ بقیہ حقوق سے ہمیں محروم کر دے۔ کانگریس نے ۴۴ سال میں مسلمانوں کو قعر مذلت میں پہنچا دیا اور لطف یہ کہ وہ ان کی محسن اور ہر دل عزیز بنی رہی۔ دوسری سیاسی پارٹیاں ابھی زیادہ آزمائی نہیں گئیں لیکن ان کے پاؤں پالنے میں پہچان تو لیے گئے۔ جنتا دل کی حکومت یہ قانون لائی ہے کہ وہ شیڈیولڈ کاسٹ افراد جو بدھ مت کو قبول کریں گے، انھیں وہ ساری مراعات حاصل رہیں گی جو تبدیلیٔ مذہب سے پہلے حاصل تھیں۔ آخر مسلمانوں نے کیا قصور کیا تھا؟ جو شیڈیولڈ کاسٹ افراد مسلمان ہو جاتے ہیں انھیں سابقہ مراعات سے کیوں محروم کر دیا جاتا ہے۔ کیا مقصد یہ ہے کہ درج فہرست طبقات میں سے کوئی فرد زیانِ مراعات کے خوف سے اسلام بھول کر بھی قبول نہ کرے۔ راقم نے شری رام ولاس پاسوان سے مطالبہ کیا کہ مسلمانوں کو بھی اس زمرہ میں شامل کر لیجیے۔ فرمایا آگے چل کر ایسا کریں گے۔ کیجیے اب انتظار فردائے قیامت تک۔

سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب تشویش ناک حد تک کم ہو گیا ہے۔ مسلمان، بلکہ ان کا کوئی اکا دکا لیڈر جرأت کے کسی لمحہ میں تحفظات یا ریزرویشن کا مطالبہ کرتا تو یا تو اسے ڈرا دیا جاتا کہ اسی فتنہ نے ملک کو تقسیم کرا دیا۔ اس کا نام بھی زبان پر لائے تو ہنگامہ ہو جائے گا، یا سمجھا دیا جاتا کہ ملک کا آئین اس کی اجازت نہیں دیتا ہے۔ مسلمان معاً ڈر بھی جاتے اور سمجھ بھی جاتے ہیں۔ الغرض دستور کو جو اقلیتوں کی حفاظت اور خوشحالی کا ضامن ہے، ان کی پسماندگی اور بدحالی کا ذریعہ بنا دیا جاتا ہے۔ شری وی پی سنگھ نے اپنی سیاسی مصلحت کے تحت لیکن بڑی جرأت کے ساتھ منڈل کمیشن کی رپورٹ کو منظور کر لیا اور پسماندہ طبقات کو تحفظات کا فائدہ پہنچانے کے ڈول ڈال دیے۔ اب کسی نے آئین کا نام لے کر اعتراض نہیں کیا۔ یہ عجیب ماجرا ہے کہ آئین کا فائدہ دوسرے اٹھائیں اور نقصان مسلمان۔ مسلمانوں کے رہنما جن میں سے بیشتر میں پیش قدمی کا شائبہ بھی باقی نہیں رہا، اب حساب لگا رہے ہیں کہ منڈل کمیشن سے انھیں کیا ملے گا اور حساب بھی نہیں لگا پا رہے ہیں۔ ہر موقع پر ان کے ہمدرد حضرات، ہندو بیک لیش (ہندوؤں کے جارحانہ ردِعمل) کا ہوّا ان کے سامنے کھڑا کر دیتے ہیں۔ ہم یہ نہیں سوچتے کہ بغیر مطالبہ کیے کچھ نہیں ملتا، نہ یہ کہ جمہوریت میں اپنا حق مانگنے کا اختیار سب کو ہے۔ جس حکومت میں یہ اختیار چھین لیا جائے اسے جمہوریت نہیں آمریت کہتے ہیں۔ حق مانگنے کا ڈھب آنا چاہیے۔ وہ ناخدا ناؤ کو ڈبو دیتے ہیں جو حق مانگتے ہیں اور ذاتی لقمہ پر سودا کر لیتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ یہ ذاتی لقمہ زر کی شکل اختیار کرے۔ اثر، اقتدار، اقربا کی نوکری، ناموری، شاہ کی مصاحبت اور سماج میں اس کا رنِ عزت۔ یہ سب ذاتی لقمہ یا منفعت کی تعریف میں آ جاتے ہیں۔ جمہوریت میں پنپ وہی لوگ سکتے ہیں جو اجتماعی مفاد کو انفرادی مفاد پر ترجیح دیں، جو خود کو باخبر اور متحد رکھیں، اور اپنے حقوق کو جرأت اور استدلال کے ساتھ طلب کریں۔

(۱۱ر اکتوبر ۱۹۹۰ء)

مسلمانوں کی ہواخیزی

ایسی بھی کسی قوم کی ہواخیزی شاید کبھی نہ ہوئی ہوگی جیسی ہندستانی مسلمانوں کی گزشتہ سات آٹھ سال میں ہوئی ہے۔ جواہر لعل نہرو نے مسلمانوں کے لیے وہ سب کچھ کیا یا نہیں کیا جو وہ کرسکتے تھے، اس پر سوالیہ نشان لگا ہوا ہے۔ آزادی سے پہلے ان سے دو بڑے سہو ہوئے جن کی بنا پر تقسیم ہند کا سانحہ ناگزیر ہوگیا۔ بحیثیت وزیر اعظم کے انھوں نے مسلمانوں کی خیر اندیشی کے اعلانوں سے دریغ نہیں کیا۔ لیکن عملاً وہ ان کے برق رفتار انحطاط کو روک نہ سکے۔ نہ انھوں نے اسے روکنے کی کوئی سنجیدہ یا موثر کوشش کی۔ لال بہادر شاستری جی کا دور مختصر تھا اور اقلیت کی نسبت سے مایوسی جیسی چلی آ رہی تھی چلتی رہی۔ زوال پذیری گویا مسلمانوں کے نامۂ اعمال میں لکھ گئی تھی۔ شریمتی اندرا گاندھی جواہر لال نہرو کی چہیتی بیٹی تھیں جنھیں خود انھوں نے پالا تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ اپنے باپ کے روابط دیکھے اور برتے تھے۔ وہ مسلمانوں کے مسائل کی اہمیت کو سمجھتی تھیں اور ان تک بہت سے مسلمانوں کی پہنچ تھی ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو سنجیدہ اور مخلص تھے اور جو انھیں مسلمانوں کی بابت صحیح مشورہ دے سکتے تھے۔ اپنی پرائم منسٹری کے دوسرے دور کے آخری دو سالوں میں اندرا گاندھی نے مسلمانوں کی طرف سے رخ پھیر لیا تھا، انھیں محسوس ہونے لگا تھا کہ مسلمانوں کو اب "اہل وفا" میں شمار نہ کرنا اور انتہا پسند ہندو جماعتوں کے ساتھ پینگ بڑھانا ان کی سیاسی بقا کے حق میں ہوگا۔ لیکن ان کے جو ذاتی روابط مسلمانوں کے ساتھ تھے انھیں نقطۂ نظر کی اس تبدیلی سے کوئی جراحت نہیں پہنچی۔ مسلم شخصیتوں اور اداروں اور ان کی اہمیت سے وہ آگاہ تھیں۔

اندرا گاندھی کے اقتدار کے دو ادوار کے درمیان جنتا پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے مرارجی ڈیسائی وزیر اعظم بنے۔ وہ ایک کھرے اور صاف گو اور تلخ گو انسان تھے۔ مسلمانوں سے انھیں کوئی خاص انسیت نہیں تھی لیکن انھوں نے نہ تو مسلمانوں کو کوئی نقصان پہنچایا، نہ کسی فریب میں رکھا۔ ایک جہاں دیدہ اور سن رسیدہ کانگریسی رہنما کی حیثیت سے وہ بھی اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ مسلمانوں میں کون کیا ہے۔

مسلمان افراد اور اداروں سے واقفیت کا یہ سلسلہ راجیو گاندھی کے برسر اقتدار آنے پر ٹوٹ گیا۔ اور اب کوئی جہاندیدہ، سنجیدہ اور ہوشمند مسلمان رہنما بھی باقی نہیں رہے جو وزیر اعظم کو مسلمانوں کی صورت حالات اور امیدوں، مسئلوں اور آرزوؤں سے آگاہ کرتے۔ دو ایک لیڈر جو بچے بھی، ان کو ہمارے نوخیز وزیر اعظم نے کوئی اہمیت نہیں دی۔ اپنے چھوٹے بھائی کے مسلک کی نادانستہ پیروی کرتے ہوئے انھوں نے اپنے گرد نوخیز مسلم رہنماؤں اور مشیروں اور صحافیوں کو جمع کیا۔ یہ سب کے سب مسلمانوں کی فلاح سے بے نیاز تھے۔ انھیں سیاسی زینہ پر تیزی کے ساتھ چڑھنے کی آرزو تھی۔ اب مسلمانوں کے لیے اپنی بات وزیر اعظم تک پہنچانا مشکل ہوگیا۔ دہشت گردوں کے خوف نے بھی وزیر اعظم کو ہندو اور مسلم دونوں عوام سے دور کر دیا۔ راجیو گاندھی میں اخیر تک وہ پختگی اور بیدار مغزی نہیں آئی جس کی توقع ایک بڑے ملک کے وزیر اعظم سے کی جاتی ہے۔ ان کی والدہ ماجدہ نے اقلیتوں کی فلاح کے لیے پندرہ نکاتی پروگرام بنایا تھا، راجیو گاندھی نے اس کی توثیق کی۔ عمل کس حد تک ہوا، اس کا ذکر آگے آئے گا۔

وشوناتھ پرتاپ سنگھ سے بڑی امیدیں تھیں۔ ان کے پاس تخیل ہے یعنی وہ دوسروں کی صورت حالات اور جذبات کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ ایک براق ذہن بھی رکھتے ہیں جو بات کی تہ تک پہنچ جاتا ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کو موہ لینے کی کوششیں بھی کیں، لیکن ان کے پاس وہی چیز نہیں تھی سربراہ حکومت کو جس کی ضرورت سب سے زیادہ ہوتی ہے یعنی فیصلہ کرنے اور اس پر اڑ جانے کی قوت۔ ان کی ذہنی چابکدستیوں اور زبانی موشگافیوں سے لوگ جلد اکتا گئے اور نہ صرف عوام بلکہ ان کے بہت سے رفقاء نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ مسلمانوں کو ان سے بھی کوئی فیض نہیں پہنچا۔ ان کے اردگرد جو مسلمان جمع ہوئے وہ اپنی بساط اور بضاعت، اخلاص اور دور اندیشی میں ان کے پیشرو کے یار ان وفادار سے کچھ بہتر نہ تھے۔ ان دونوں وزرائے اعظم کے ادوار میں مسلمانوں کی نمایندگی طالع آزما، ماخود نگر اور کم اندیش یا کج اندیش افراد کے ہاتھوں میں پہنچ گئی۔ ایودھیا کے تنازعہ کے باعث جابجا فسادات ہوئے جن میں مسلمانوں کی جان و مال اور دان سے بھی زیادہ) حوصلہ کا بڑا زیاں ہوا۔ ان فسادات کا سلسلۂ نسب راجیو گاندھی اور وی پی سنگھ تک پہنچتا ہے۔ حالانکہ ذمہ داری سب سے زیادہ بھاجپا کی ہے۔ آگ بھڑکانے میں بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے رہنماؤں کی حقیقت فراموشی، انتہا پسندی اور گل افشانی گفتار کو بھی دخل رہا ہے۔

شری نرسمہاراؤ تجربہ کار، دور اندیش اور ٹھنڈے مزاج کے وزیر اعظم ہیں لیکن ابھی تک انھوں نے کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا جس سے یہ اندازہ ہو کہ ان کا گوشۂ خاطر اقلیتوں کی طرف ہے۔ ان کے بارے میں یہ رائے زور پکڑتی جا رہی ہے کہ وہ بھی پہلے دو وزیر اعظموں کی طرح بھاجپا کے دست نگر ہیں۔ ہندستانی مسلمانوں کے پاس

نہ اب آوازہ رہ گئی ہے نہ رسائی۔ طالع آزماؤں اور خود افرازوں کی بن پائی ہے۔ یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا ملک امریکا کا تابع فرمان بن گیا ہے اور ہماری مالی اور خارجہ پالیسی کا سرچشمہ نئی دنیا کے اشارے اور ارشادات ہیں۔ ہندستان نے حال ہی میں پے درپے اسرائیل کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے۔ اسے اب یہ فکر بھی نہیں رہی کہ ہندستانی مسلمان ہماری خارجہ پالیسی کی اس قلابازی کو پسند نہیں کریں گے۔ اور بیشتر عرب ممالک ہند کی یہود نوازی کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے۔ بش صاحب کا جادو ساری دنیا کے سر پر چڑھ کر بول رہا ہے۔ ہندستانی مسلمان اور عرب ملک کسی شمار و قطار میں نہیں۔"

سرکاری پالیسی کے نیتجہ میں اردو زبان کا چلن اٹھتا جا رہا ہے۔ یو پی سے، اپنے گھر سے، یہ زبان بے دخل ہو گئی ہے۔ بہلانے بھسلانے کے لیے ایک جعفری کمیٹی مرکزی سرکار نے بنادی۔ جس کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ گجرال کمیٹی کی رپورٹ پر جسے ۱۵ سال ہو چکے تھے اپنی رپورٹ پیش کرے۔ گجرال کمیٹی کی رپورٹ کوئی دیوانِ غالب تو تھی نہیں کہ اس کو شرح درکار ہو۔ چونکہ مطالبہ اردو والوں کا تھا۔ بیشتر جن میں سے مسلمان ہیں اس لیے اس کو بہ لطائف الحیل ۱۷ سال سے کھٹائی میں ڈال رکھا ہے۔ جعفری کمیٹی کی غیر ضروری رپورٹ جب تیار ہو گئی تو اسے ایک سرکاری کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا۔ ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ لاکھ فریاد کیجیے سرکار کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی۔ اگر ارباب اختیار سے ملنا چاہیے تو جواب ندارد۔ اردو کے بارے میں اتر پردیش کی سرکار کا رویہ اور زیادہ حقارت آمیز ہے۔ اردو کا سب سے بڑا ادارہ انٹرویو چاہا کرے کبھی نہیں ملے گا۔ ان حکومتوں کو تناسب کا احساس نہیں رہا، یا وہ اردو والوں کو ان کی اوقات جتانا چاہتی ہیں۔ جب تک پارٹی کے کسی آدمی کو بیچ میں نہ ڈ لیے، ملاقات نہیں ہو سکے گی، اردو والوں کی اب یہ حیثیت رہ گئی ہے۔"

مرکزی حکومت نے اقلیتوں کے بارے میں پالیسی کی عمل آوری کا جائزہ لینے کے لیے ایک کمیٹی بنائی۔ روئے سخن خاص طور پر پندرہ نکاتی پروگرام اور نئی تعلیمی پالیسی کے عملی پروگرام کی طرف تھا۔ کمیٹی معائنہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچی کہ جہاں تک تعلیمی پالیسی کا تعلق ہے سرے سے اس پر عمل ہی نہیں ہوا۔ لیکن پالیسی بنانے اور اسے بجالانے والوں نے نہ تو پشیمانی کا اظہار کیا نہ تلافی کا سرو سامان۔ اس کی رپورٹ بھی ہوا میں لٹکی ہوئی ہے۔

یو پی میں اب بھاجپا کی حکومت ہے۔ خود کانگریسی سرکاروں نے ہی وہاں اردو کے لیے کیا کیا تھا جو بھاجپا سرکار کچھ کرتی۔ وہ بھی جانتی ہے کہ اردو والوں اور مسلمانوں کی کوئی آواز نہیں ہے، اور یہ لوگ یعنی ان کے بیشتر ترجمان بے حس یا بکاؤ ہیں۔ سرکار جب چاہے ان کا منہ بند کر سکتی ہے یا ان کی قیمت لگا سکتی ہے۔ ان

کو یہ بھی شعور نہیں کہ مطالبہ میں وزن، اتحاد اور تنظیم سے پیدا ہوتا ہے۔ انھیں سیاسی پارٹیوں اور حکومتوں پر اثر انداز ہونے کے گر بھی نہیں آتے۔

بھاجپا کے صدر شری مرلی منوہر جوشی نے یاترا نکالی جو کیرالا سے شروع ہوئی۔ اس کا ہدف یہ تھا کہ سری نگر کے لال چوک میں جاکر قومی پرچم لہرایا جائے۔ اس پرچم کشائی کے پیچھے آرٹیکل ۳۷۰ کی منسوخی کی مانگ تھی، تاکہ ساری وادی اہل کشمیر کے ہاتھوں سے نکل جائے اور وہ شانِ امتیاز جو ان کے لیے سرمایۂ افتخار تھی مٹ جائے۔ یاترا ابھی کشمیر سے بہت دور ہی تھی کہ سب کو یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ یاترا وادی میں داخل نہ ہوسکے گی، لیکن بھاجپا کا بھرم رکھنا سرکار پر واجب تھا۔ کیونکہ بھاجپا کی مدد اسے درکار تھی اور کشمیر کے سرکشوں کو بھی پیغام پہنچانا تھا۔ چنانچہ جوشی جی اور ان کے کچھ ساتھیوں کو طیارہ سے سری نگر پہنچایا گیا۔ انھوں نے فوج اور پولیس کی حفاظت میں جھنڈا پھرایا۔ فوج اور پولیس نے بھی اس سے ضروری نتائج اخذ کر لیے ہوں گے۔ ہوا کا رخ ہوا میں بل کھاتے ہوئے تنکوں سے دریافت کرلیا جاتا ہے۔ بھاجپا کو ہوا خیزی سے صاف بچا دیا، اس کے لکش کو بھی پورا کرا دیا۔

کیا ہندستانی مسلمان اپنے خلاف تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کو سمجھنے سے انکار کرتے رہیں گے۔ کیا وہ اتنی کثیر آبادی میں ہوتے ہوئے بھی حقیر اور بے وقعت بن جانے پر راضی ہو جائیں گے۔ ہوا کا رُخ بہت سرعت کے ساتھ بدل رہا ہے ہماری ناؤ ہچکولے لے رہی ہے ڈگمگا رہی ہے۔

نہیں لیتے کروٹ مگر اہل کشتی
پڑے سوتے ہیں بے خبر اہل کشتی

اب ہماری بات سرکار تک پہنچے تو کیوں کر، اور وہ اسے سُن کر اس پر غور کرے تو کیوں۔ ہوا ایک بار اکھڑ جائے تو بڑی مشکل سے بحال ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں جو لوگ ہوش و گوش اور دردمندی رکھتے ہیں، ان کی کوئی سُنتا نہیں۔ جو اشخاص اربابِ اقتدار کے پاس پہنچ گئے ہیں ان کے پلّہ میں نہ خلوص ہے، نہ ہمدردی، نہ سوجھ بوجھ۔

سارے قرائن یہ کہہ رہے ہیں کہ ہندستانی مسلمان تیز رو ادبار سے دوچار ہیں۔ ان کے رو بہ زوال ہونے کی کہانی اعداد و شمار کی زبانی سنیے اور ان کی کم اعتباری اہل وطن کی نگاہوں سے دیکھیے۔ ان کی بے بضاعتی پر ارباب اقتدار کو خندہ زن پایئے۔ جب قوا میں اضمحلال آجائے گا جب ہمّت ٹوٹ جائے گی، جب احساسِ تناسب گرفت سے نکل جائے گا۔ جب اچھے اور برے، اہم اور غیر اہم کا امتیاز باقی نہ رہے گا، جب اتحاد کا دامن پارہ پارہ ہوجائے گا، جب ملّت کا شیرازہ بکھر جائے گا، تو اسے عزّت کی نگاہ سے کون دیکھے گا، اسے کون وقعت دے گا، کون اسے اپنے پاس بیٹھائے گا؟ ہم اہل وطن کی نگاہوں میں جو سُبک ہوئے ہیں، یہ بے وجہ نہیں ہے۔ (مارچ ۹۲ء)

کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

بچپنے کی پہچان یہ بھی ہے کہ انسان کھلونا دیکھ کر مچل جائے، ہاتھ آجائے تو بہل جائے۔ "بچپنے" کی جگہ "سادہ لوحی" بھی کہہ سکتے ہیں، اور "بے وقوفی" اور "بے اٹکلی" بھی۔ یہ وصف کسی فرد میں پایا جائے تو مسکرا دیجیے، اگر کسی جماعت میں نظر آئے تو ماتم کیجیے کہ وہ ضروری اور غیر ضروری، اہم اور غیر اہم کے درمیان امتیاز نہیں کر پائے گی اور زندگی کے ہر موڑ پر ٹوٹے میں رہے گی یا ضروری کو سمجھ نہیں پائے گی، غیر ضروری میں الجھ جائے گی۔ ایک عرصے سے ہندستانی مسلمانوں کا حال کچھ ایسا ہی ہے۔ کسی مسلمان کو صدر جمہوریہ بنایا جائے تو وہ پھولے نہ سمائیں گے، بھول جائیں گے کہ اس سے انھیں کچھ فیض پہنچنے والا نہیں ہے۔ یوں بھی یہ منصب محض آئینی اور تزئینی ہے، اور پھر مسلمان جو اس منصب پر پہنچ جاتا ہے، وہ اس کے بوجھ کے نیچے دب جاتا ہے، وہ کرسی پر اس طرح بیٹھتا ہے کہ پانو زمین کو چھو نہیں پاتے، ہوا میں لٹکے رہتے ہیں، گویا بچے کو بڑوں کی کرسی پر بیٹھا دیا گیا ہو۔

اب تک دو مثالیں ایسی ہوئی ہیں: ایک نے مرعوب ہو کر اردو کو خیر باد کہہ دیا، بچاری فریاد کرتی رہی۔ کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔ لیکن وہ اسے نہ پہچانے، نہ یاد کیا۔ دوسرے نے بے تمیزی سے ڈر کر بادلِ ناخواستہ ایسی جگہ دستخط کر دیے جہاں انھیں نہیں کرنے چاہیے تھے۔ غفور[1] میاں کے بہ قول صدر مملکت اور چیف جسٹس سپریم کورٹ کے بجائے اگر تھانوں میں تھانے دار اور سپاہی "بحال" ہوتے تو مسلمانوں کے زیادہ کام آتے۔

اُن عہدوں سے مسلمان بھر پائے جو زیب و زینت اور دکھاوے کے لیے بھرے جاتے ہیں، انھیں تو وہ نوکریاں درکار ہیں جو مؤثر ہوتی ہیں، جن کے سایہ میں روزمرّہ کے کام چلتے ہیں یا سلامتی اور حفاظت کا احساس پیدا ہوتا ہے، یا اعتماد نشو و نما پاتا ہے۔ ہندستان کے کونے کونے سے یہ آواز اٹھنی چاہیے تھی کہ نمائشی مناصب کو سینت کر رکھیے،

---

[1] سابق وزیر اعلا بہار

آبادی کو دیکھتے ہوئے نوکریوں میں ہمیں جگہ دیجیے۔ کسی مسلمان کا بہ حیثیت صدر جمہوریہ تقرر غیر ضروری اور غیر مفید تھا ضروری دراصل ہے دفاتر اور عام نوکریوں میں مسلمانوں کی متناسب نمایندگی۔ ناداں مسلمان کھلونوں سے بہل گئے، فروعی باتوں میں الجھ گئے، ان باتوں کو جو اصلی، ضروری اور کارگر ہیں نظر انداز کر بیٹھے۔ حیرت بھی کیوں ہو، بے وقوف بننے کے لیے جو مستعد رہتا ہو، اسے بے وقوف بنایا ہی جائے گا۔

اردو کے تئیں بھی حکومت کا رخ ایسا ہی رہا۔ اردو کی شیرینی، اس کے ذریعہ ملی جلی تہذیب کی ترجمانی، اس کے حسنِ بیان اور صلاحیتِ ادا، اس کی ملک گیر حیثیت اس کے متمول ادب، اس کی شعر و شاعری، اس کی غزل، کے گن ارباب اختیار اور اہلِ وطن مناسب وقفوں کے ساتھ گاتے رہے، انھیں سن کر مسلمان باغ باغ ہوتے رہے، غافل اس بات سے کہ جسے وہ قصیدہ سمجھے ہیں، وہ دراصل نوحہ ہے، مرثیہ ہے جس کی دھن کے ساتھ اردو کو ریاستوں اور گھروں سے نکالا جا رہا ہے، اردو کے شیدائی خوش ہو گئے، مطمئن ہو کر بیٹھ گئے کہ ہماری زبان کی کتنی تعریف ہو رہی ہے۔

فسادات ہوتے رہیں، مسلمانوں کو یکسو ہو کر کاروبار اور روزگار میں جمنے نہ دیا جائے، خونریزیوں کا تانتا بندھ جائے، پائوں اکھڑ جائیں، حوصلہ ٹوٹ جائے۔ یہ سب کچھ ہوتا رہے اور فسادات کو روکنے کا کوئی مؤثر بندوبست نہ کیا جائے۔ کمیشنوں کی رپورٹیں کچھ کہتی رہیں لیکن یہ داستان پھر بھی دہرائی جائے کہ فساد کی شروعات مسلمان کرتے ہیں۔ تاہم مسلمانوں کی اشک شوئی کے لیے یہ اعلان کیا کم ہے کہ میلادالنبی کے روز چھٹی ملا کرے گی۔ سارے گلے تمام ہوئے ایک جواب میں۔

تعلیم اور معیشت میں مسلمان پچھڑتے چلے جائیں[1] ان کی شرح خواندگی کو ۵۴ سال تک چھپا کر رکھا جائے، کہیں ایسا نہ ہو کہ انھیں اپنی تعلیمی پسماندگی کا احساس ہو جائے اور وہ آگے بڑھنے کی کوشش کرنے لگیں، ان کی آبادیوں کے قریب اسکول نہ کھولے جائیں، خود وہ جو اسکول کھولیں انھیں سالوں تک اقلیتی کردار سے محروم رکھا جائے۔ ان کے مخصوص تعلیمی مسایل مثلاً ڈراپ آؤٹ اور تعلیم نسواں کی طرف کوئی دھیان نہ دیا جائے، ان کے اہل حرفہ کے بچے صنعتی تعلیم سے محروم رہیں، ان کے گھروں میں گھن لگا دینے والی بیماری مسکن بنا لے۔ نہ ان کے گھروں سے بیماری دور کرنے کے جتن کیے جائیں، نہ بچوں کی صنعتی تربیت کا اہتمام ہو۔ اقلیتوں کی تعلیم کے لیے نئی تعلیمی پالیسی کے عملی پروگرام میں بہت سے اقدامات قلمبند کیے جائیں، ان میں سے ایک پر بھی عمل نہ ہو۔ ان ساری کوتاہیوں اور غفلتوں کی مؤثر تلافی یہ ہے کہ مرکزی اقلیتی کمیشن کو قانونی حیثیت دے دی جائے۔ شاید ہی کبھی کوئی جماعت

---

[1] ان باتوں کا اطلاق شمالی ہندستان پر بالعموم اور ملک کی سب سے بڑی ریاست اتر پردیش پر بالخصوص ہوتا ہے۔

اتنی فریب آشام ہوئی ہوگی جتنے ہندستانی مسلمان ہیں۔ وہ خود تو کچھ کرتے نہیں اور حکومت کو جو کچھ ان کے لیے کرنا چاہیے اس کا مطالبہ بھی نہیں کرتے۔ الفاظ کے پیچاک میں پھنس کر رہ جاتے ہیں۔ سرکار نے ایک خوش آیند اعلان کر دیا اور یہ ساری شکایتیں بھول گئے۔

بایک حدیث لطف کہ آں ہم دروغ بود
امشب ز دفترِ گلہ صد باب شستہ ایم

(آج رات ان کی طرف سے لگاوٹ کی ایک بات سُن کر جو سراسر جھوٹ تھی، ہم نے شکایتوں کے دفتر کے سو باب دھو ڈالے)

کوئی پوچھے کہ آج تک اقلیتی کمیشن کے ذریعہ کوئی مسئلہ بھی مسلمانوں کا حل ہوا ہے؟ اس کی کسی بات کو سرکار نے مانا ہے؟ اس کے ذریعہ ہمارے کسی دُکھ کا مداوا ہوا ہے؟ ناانصافیوں کا ازالہ اور مظالم کی دادرسی تو دور کی بات ہے، کمیشن کو اقلیتوں کی صورت حالات کے بارے میں اطلاعات حاصل کرنے کی توفیق بھی نہیں ہوئی۔ مرکزی کمیشن کی گدّی پر ایک عرصہ تک ایک ایسے بزرگ براجمان رہے جو کمیشن کی ضرورت اور وجود کے ہی منکر تھے۔

ہاں کھائیو مت فریب ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

جنھیں احساس ہی نہیں تھا کہ اقلیتوں کے کوئی اپنے الگ مسائل بھی ہو سکتے ہیں، جو برابر انسانی حقوق کا راگ الاپتے رہے، اور بالآخر خاکستر ہو گئے۔ ان سے زیادہ موزوں شخص اس منصب کے لیے کب رہا ہوگا۔ لیکن موزونیت کا پیمانہ سرکار کے نزدیک اقلیتوں سے بے تعلقی اور سرکار کے ساتھ علاقہ مندی رہا ہے۔ کم یا زیادہ اس معیار پر صدورِ محترم پورے اترتے رہے ہیں۔ ان میں سے جن افراد نے اقلیتوں کے ساتھ وابستگی دکھائی، حکومت نے ان سے اوّلین فرصت میں وارستگی حاصل کر لی۔ سادہ لوح اقلیت اتنا بھی نہیں سمجھ پائی کہ سرکار اقلیتی کمیشن کو پالیسی کے طور پر ایسے افراد سے ہی بھرے گی جو اس کی ہر بات پر آمنّا وصدقنا کہنے کے لیے تیار ہوں، اور جو کبھی کوئی ایسی بات نہ کہیں جس سے سرکار کو خفیف ہونا پڑے۔ ایک صاحب نے اس روش سے انحراف کیا تو عمّال نے اُن پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا، انھیں عضوِ معطل بنا کر چھوڑ دیا۔ ساخت جب کمیشن کی ایسی ہو تو اس سے امیدیں کیوں باندھی جائیں؟ ہر چند کہ کمیشن ساری اقلیتوں کے لیے وضع ہوا ہے لیکن اس کا روئے سخن مسلمانوں کی طرف اور مطلوبہ افادیت مسلمانوں کے لیے ہے، کہ در اصل پسماندہ اقلیت وہی ہیں۔

اس بے اشکل ملت کی سمجھ میں ابھی تک یہ موٹی سی بات نہیں آئی کہ وہ

سرکاری یا نیم سرکاری ادارے جو کسی اقلیت کے مفاد میں قائم کیے جاتے ہیں اور حکومت کے وہ فیصلے جو اس اقلیت کے حق میں صادر ہوتے ہیں، ان میں جان جب ہی پڑتی ہے جب وہ اقلیت باخبر، باشعور اور متحد ہو۔ اگر ایسا نہیں ہے تو وہ ادارے اور فیصلے بے جان، بے مصرف اور دکھاوٹی بن کر رہ جاتے ہیں، اس کاغذ سے بھی زیادہ بے وزن جس پر وہ قلمبند ہوئے ہیں۔ مسلمان اگر اسی طرح بے اتحاد، بے خبر اور بے شعور رہے اور انھوں نے حکومت اور اس کے اہلکاروں پر نگرانی اور احتساب کی نگاہ نہیں رکھی تو ان اداروں اور فیصلوں سے جو بظاہر ان کے حق میں کیے گئے ہیں، انھیں کوئی فیض نہیں پہنچے گا، خواہ ان اداروں کے سربراہ مسلمان ہی کیوں نہ ہوں۔ ٹروجن گھوڑے (TROJAN HORSE) اور پورس کے ہاتھی کی داستانیں اگرچہ بظاہر جانوروں کے گرد گردش کرتی ہیں لیکن ان کا اطلاق ہر زمانے میں انسانوں پر ہوتا رہا ہے۔

کیا ہم نے کبھی سوچا کہ اقلیتی کمیشن اب تک غیر مؤثر کیوں رہا، جو کچھ سفارشات بھی اس نے کیں حکومت اور اس کے اہلکاروں نے ان کی طرف دھیان نہیں دیا۔ کمیشن کو قانونی حیثیت مل جانے سے حکومت کے رویّہ میں کوئی فرق نہیں آئے گا نہ مسلمانوں کی بات میں وزن پیدا ہوگا، نہ ان میں یک لخت یہ صلاحیت آجائے گی کہ اپنے تئیں حکومت کے رویہ اور اپنے آئینی حقوق کی نگہبانی اور نگرانی کرسکیں۔ اب جو قانونی حیثیت مل گئی، اس پر مسلمان بغلیں بجا رہے ہیں، جنگ زرگری کے طور پر بھاجپا نے ایوان میں اس تجویز کی سخت مخالفت کی۔ وہ جانتی ہے اور سادہ لوح مسلمان نہیں جانتے کہ کمیشن کی اس نقلِ ہیئت سے اقلیتوں کو کچھ ملنے والا نہیں بھارت سرکار اچھی طرح واقف ہے کہ ہاتھی کے دانت دکھانے کے اور ہوتے ہیں، کھانے کے اور۔ اس کا روئے سخن اور زاویۂ نگاہ دکھانے کے دانتوں کی طرف رہتا ہے، نمایش اور آرایش کا ساز و سامان ہاتھی کے دکھانے والے دانتوں سے ہی بنتا ہے۔ اگر حکومت کے رخ میں سنجیدگی کی رمق بھی ہوتی، اور سب سے بڑی اقلیت رائے عامہ اور شعور سے محروم نہ ہوتی، تو سرکار بجائے کمیشن کو قانونی حیثیت دینے کے ان ہی سفارشات کا جائزہ لے لیتی جو اطاعت شعار اقلیتی کمیشن نے دبی زبان سے مختلف اوقات میں کی ہیں اور ان کو معرضِ عمل میں لے آتی۔ مسلمان کچھ نہیں مانگتے ہیں، وہ تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ ان کے جان و مال، عزت و آبرو کی حفاظت کی جائے کہ حکومت کا یہ اولین فرض ہے، ان کی تعلیمی اور سماجی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے مؤثر اقدامات کیے جائیں، انھیں اپنے مذہب، ثقافت روایت، زبان اور ادب کو فروغ دینے کا موقع دیا جائے اور اس بات کا اہتمام کیا جائے کہ انھیں نوکریوں میں آبادی کے تناسب سے نمایندگی مل جائے۔ کمیشن ان بے ضرر اور واجب مانگوں کو منوا نہ سکا، اس پر سے قلعی اترنے لگی اور اس کی

بے افادی جھلکنے لگی تو اس پر ایک ملمع قانونی حیثیت کا چڑھا دیا گیا۔

عجیب ماجرا ہے اتنی بڑی اقلیت پچھڑتی جا رہی ہے اور کسی کے ماتھے پر بل بھی نہیں پڑتے۔ کہنے والے تو یہ بھی کہہ جاتے ہیں کہ ہماری آزاد جمہوریت میں سب کو مقابلہ کا برابر حق حاصل ہے۔ مسلمان اگر مقابلہ نہیں کرتے، نوکریاں نہیں حاصل کرتے تو قصور کس کا ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ نابرابروں میں مقابلہ کرانا سب سے بڑی ناانصافی ہے۔ ہماری انتظامیہ تو ان امور میں بے حس ہو چکی ہے لیکن عدلیہ نے جس کا ضمیر مردہ نہیں ہوا، کئی تجویزوں میں یہ بات کہہ دی ہے کہ کمزور کو طاقتور، پسماندہ کو پیش رفتہ کے ساتھ مقابلہ پر مجبور کرنا کمزور اور پسماندہ کے ساتھ بہت بڑی زیادتی ہے۔ یہ بات تو بالکل کھلی ہوئی اور بدیہی ہے کہ اگر سب سے پچھڑی ہوئی اقلیت کو ملازمتوں میں تحفظ نہ دیا گیا تو وہ اور پچھڑ جائے گی اور اپنے وطن عزیز کو بھی اپنے ساتھ پیچھے کی طرف گھسیٹ لے گی۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں اپنے وطن کے تئیں کوئی ولولہ اس کے دل میں پیدا نہ ہو سکے گا۔ ان تحفظات کی راہ میں دستور ہند حائل نہیں معاون ہوگا۔ ہماری بدقسمتی نہیں تو کیا ہے کہ ہمارے ترجمان حوصلہ، اعتماد اور انصاف کے ساتھ خدا لگتی بات کہنے کے بجائے سراسیمہ اور مرعوب اور خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ دورِ انحطاط کی یہ سب سے واضح اور محکم نشانی ہے۔

انصاف تو جب ہوتا جب لسانی اقلیتوں کے کمیشن نے زبانوں کے بارے میں اور اقلیتی کمیشن نے اقلیتوں کی نسبت سے جو سفارشیں اور تجویزیں مختلف اوقات میں کی ہیں، ان کو حکومت منظور کرتی، ان پر عمل کیا جاتا۔ تب تو کچھ حاصل ہوتا، تو کوئی بات ہوتی۔ حکومت بھی ہمیں خوب سمجھ گئی ہے۔ جانتی ہے کہ ہم ایامِ طفولیت میں ہیں، ہمیں سایہ کے پیچھے دوڑایا جا سکتا ہے، کھلونے دے کے بہلایا جا سکتا ہے۔

(۲۵ مئی ۱۹۶۲ء)

وعدہ خلافی یا غفلت کا خمیازہ؟

ہندستان کے دستور نے اقلیتوں کے ساتھ بہت سے وعدے کیے۔ حکومت کی باگ ڈور جن ہاتھوں میں آتی رہی انھوں نے ان وعدوں کو نباہا نہیں۔ اس وعدہ خلافی کا نقصان مسلمانوں کو پہنچا جو سب سے پسماندہ اقلیت ہیں۔ سرکار بے دھڑک وعدہ خلافی کرتی رہی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ مسلمان اپنی کھال میں مست ہیں، اور ان کے رہنماؤں کو خود غرضی اور ذاتی طالع آزمائی سے فرصت کہاں کہ وہ الٹے باتوں کی جانب دھیان دیں جن سے ملّت کی بنیادیں مضبوط ہوتی ہیں اور اس کا مستقبل بنتا ہے۔ گویا حکومت کی پیماں شکنی کو ہماری غفلت برابر شہ دیتی رہی۔ اس سے یہ بات الم نشرح ہوتی ہے کہ دستور سازوں کی وسیع القلبی اور بالغ نظری سے ان کے بعد آنے والے ہمارے اہلِ اختیار محروم رہے، اور یہ محرومی دن بدن بڑھتی چلی گئی، اور فی زمانہ تو اربابِ اقتدار کی بے بصری اور جاہ طلبی اپنے عروج کو پہنچ گئی ہے، اور ہمارے سامنے ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ ہم میں سے کوئی ان کا شمار رکھنے والا بھی نہیں۔

اللہ بدگمانی سے بچائے۔ مگر لگتا کچھ ایسا ہے کہ ہمارے اہلِ وطن ہماری جہالت پر مطمئن ہے۔ اوّل تو ہمیں بتاتے ہی نہیں کہ ہماری شرح خواندگی آزادی کے وقت کیا تھی اور اب کیا ہے۔ مردم شماری کے دوران فرقہ وار شرح خواندگی اکٹھا کی جاتی ہے لیکن آزادی کے بعد اسے مقفّل کر کے رکھا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر مسلمانوں کو اپنی تعلیمی پسماندگی کا پتا چلتا تو انھیں تکلیف ہوتی اور سرکار کب چاہتی ہے کہ انھیں تکلیف ہو یا وہ آگے بڑھنے کے زہرہ گداز جتن کریں۔ بیچاروں کو چین سے رہنے دیا جائے، یہی ان پر سب سے بڑا احسان ہے۔ ہم اس نتیجہ پر اعداد و شمار کی پردہ پوشی کی بنا پر ہی نہیں پہنچے ہیں۔ ہماری تعلیم کی راہ میں روڑے جو اٹکائے گئے ہیں وہ بھی اسی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ مرے پر سو دُرّے۔ اس سے بہتر شرکتِ کار کی مثال کہاں مل سکتی ہے؟ دیکھیے تو آغازِ داستان میں کیا کیا پیمان کیے گئے تھے۔

آئین کے آرٹیکل ۲۹ (۱) میں وعدہ کیا گیا ہے کہ شہریوں کے ہر طبقہ کو جو ہندستان یا اس کے کسی حصہ میں رہتا ہے اور جس کی اپنی علاحدہ زبان، رسمِ خط یا ثقافت ہے یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ ان کو محفوظ رکھے۔

آرٹیکل ۳۰ (۱) میں وعدہ کیا گیا ہے کہ تمام اقلیتوں کو چاہے وہ مذہب پر مبنی ہوں چاہے زبان پر، یہ حق حاصل ہوگا کہ اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کریں اور انھیں چلائیں۔

آرٹیکل ۳۰ (۲) کا تقاضا ہے کہ تعلیمی اداروں کو امداد دیتے وقت ریاست کسی تعلیمی ادارے کے خلاف اس بنا پر امتیاز نہیں کرے گی کہ وہ کسی مذہبی یا لسانی اقلیت کے زیر انتظام ہیں۔

آرٹیکل ۳۵۰ (الف) کے تحت ریاست میں ہر مقامی انتظامیہ (لوکل باڈی) یہ کوشش کرے گی کہ اقلیتوں کے بچّوں کو تعلیم کی ابتدائی منزل میں مادری زبان میں تعلیم کی مکمل سہولتیں فراہم کی جائیں اور ان سہولتوں کو فراہم کرانے کے لیے صدر جمہوریہ کسی ریاست کو وہ ہدایات جنھیں وہ ضروری سمجھتا ہو جاری کر سکتا ہے۔

قارئین غور کریں کہ آرٹیکل ۲۹ (۱) کے باوجود مسلمانوں کو اردو، اس کے رسمِ خط اور ثقافت کو محفوظ رکھنے میں کتنی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے

(آرٹیکل ۲۹ (۱))

مسلمانوں اور اردو والوں سے پوچھیے، خصوصًا شمالی ہندستان میں کہ اپنی پسند کے تعلیمی اداروں کو چلانے کے لیے اور ان کے وجود کو ریاستی سرکار یا نظامتِ تعلیم سے تسلیم کروانے میں انھیں کیا کیا ہفتخواں طے کرنے پڑتے ہیں۔ انھیں برسوں سرکار کے دروازہ پر دستک دینی پڑتی ہے، ان میں سے بہت سے تھک ہار کر بیٹھ جاتے ہیں۔ مرکزی سرکار اور مرکزی اقلیتی کمیشن اس ضمن میں ریاستی حکومتوں کو رہنما خطوط جاری کرتا رہتا ہے، لیکن ریاستی حکومتیں اور ان کے کار پردازان ہدایتوں کو برملا حقارت کے ساتھ ایک طرف کر دیتے ہیں۔

آرٹیکل ۳۵۰ (الف) کو بھی دستور کی زینت بنا کر رکھا گیا ہے، بہار کو چھوڑ کر ہندی ریاستوں میں اردو مادری زبان والے بچّوں کی اردو میں ابتدائی تعلیم کا سروسامان ہے ہی نہیں۔ یو۔ پی میں حالت سب سے زیادہ ابتر ہے۔ مسلمانوں نے شروع میں ہی ہتھیار ڈال دیے۔ سرکار نے بہ لطائف الحیل اردو کو پردیش نکالا دے دیا اور اردو والے پائو توڑ کر بیٹھ رہے۔ صدر جمہوریہ دستور کی خلاف ورزی کو دیکھتے رہے، انھیں بھی توفیق نہیں ہوئی کہ وہ اتر پردیش کی حکومت کو ضروری ہدایتیں دیتے۔ مسلمانوں نے نباہی کا جو سفر طے کیا ہے اس میں ہر موڑ پر سرکار اور ان کے درمیان حسنِ تعاون کی

دلفریب مثالیں ملتی ہیں۔ تعاون کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ دونوں ذمّہ داری سے بچ جاتے ہیں، اور کوئی کسی کو الزام نہیں دے سکتا، اور اگر الزام دے بھی دیے گئے تو دو طرفہ، عوض معاوضہ گلہ نہ دارد۔ ایک (سرکار) نے توجّہ نہیں کی، دوسرے (مسلمانوں) نے کوشش نہیں کی، دونوں برابر۔ سرکار کہہ دیتی ہے مسلمان مقابلہ نہیں کرتے، مسلمان کہتے ہیں ہم مقابلہ کیوں کریں جب نتیجہ ظاہر ہے۔ نابرابروں میں مقابلہ کیسا؟

حکومت کے پاس ایک حربہ اور بھی ہے "اعلان کرو، فیصلے کرو، وعدے کرو، لیکن کیا تم نے انھیں عمل میں لانے کا بھی ٹھیکہ لیا ہے؟ جس سے وعدے کیے، جس کے حق میں اعلان کیے، اس کا جی خوش ہوگیا، یہی کیا کم ہے"؟ دستورِ ہند نے اور اقلیتوں کے ساتھ مسلمانوں سے جو وعدے کیے تھے، سرکار نے انھیں کس طرح پورا کیا، یہ ہم دیکھ ہی چکے ہیں۔ لیکن وہ تو دستور سازوں کے وعدے تھے، سرکار انھیں ایفا نہ کر پائی تو اسے دوش کیوں دیں۔ ہم تو ان وعدوں کی کھوج میں نکلیں گے جو خود حکومت نے کیے تھے۔

۱۹۸۶ء میں ملک نے نئی تعلیمی پالیسی بنائی جس پر سنسد نے منظوری کی مہر لگائی "نئی تعلیمی پالیسی کے عملی پروگرام" میں اقلیتوں کی تعلیم پر ایک پورا باب ہے، جس میں پسماندہ اقلیتوں یعنی مسلمانوں اور نو بدھوں (بدھ مت کے جدید ماننے والوں، ڈاکٹر امبیڈکر کے ہاتھوں بدھ مت قبول کرنے والوں) کے تعلیمی پچھڑے پن کو دور کرنے کے لیے اہم اقدامات قلمبند کیے گئے۔ ابھی عملی پروگرام بنایا نہیں گیا تھا کہ ۱۹۸۶ء کی قومی تعلیمی پالیسی میں صاف صاف لکھ دیا گیا کہ پسماندہ اقلیتی جماعتوں کی تعلیم کی طرف زیادہ توجّہ دی جائے گی کہ مساوات اور سماجی انصاف کا یہی تقاضا ہے" اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو ذرائع اختیار کیے جائیں گے، ان کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

(۱) روایتی اسکولوں (یعنی مدارس) میں رضا کارانہ ڈھنگ سے سائنس، ریاضی اور انگریزی پڑھانے کے لیے اقدامات کیے جائیں گے۔ جہاں کہیں ممکن ہوا ان مدارس میں ابتدائے طفولیّت کے تعلیمی مراکز (EARLY CHILDHOOD EDUCATION CENTRES) کھولے جائیں گے خصوصاً ان علاقوں میں جہاں تعلیمی اعتبار سے پسماندہ اقلیتوں کی گھنی آبادی ہے۔ ان اداروں میں سماجی اعتبار سے کار آمد کام (SOCIALLY USEFUL PRODUCTIVE WORK) سکھایا جائے گا۔ شعبۂ تعلیم اس مقصد کے حصول کے لیے مرکزی امداد کی ایک اسکیم وضع کرے گا۔

ابتدائی تعلیم :- (۲) ابتدائی تعلیم کا جہاں تک تعلق ہے اس کی ان شماریاتی اطلاعات کی فراہمی کے لیے ایک نظم قائم کیا جائے گا جن کی ضرورت لسانی اقلیتوں کے کمشنر کو ہوتی ہے۔ ریاستی حکومتیں اس کو عمل میں لائیں گی۔

(۳) لسانی اقلیتوں کے لیے ٹیچروں کی اسامیوں کی منظوری میں جو تاخیر ہوتی ہے اس کو دور کرنے کے لیے ضروری اختیارات ضلع کلکٹر کو دے دیے جائیں گے۔ ریاستی حکومتیں اس پر عمل کریں گی۔

(۴) اقلیتی زبانوں میں نصابی کتابوں کی دستیابی کا سروے کیا جائے گا اور ان زبانوں میں طباعتی سہولتوں کی فراہمی کا بندوبست ہوگا۔ اس کی عمل آوری ریاستی حکومت کے ذمہ رہے گی۔

(۵) اقلیتی زبانوں کے لیے اساتذہ کی تربیت کی سہولتوں کا جائزہ اور جہاں جہاں ضروری ہو، ان میں اضافہ ۔ بارِ عمل ریاستی حکومتوں پر۔

(۶) نصاب کی مدت کا ۱۵ فی صد مقامی صنعتوں اور دھندوں کی تربیت میں صرف کیا جائے گا اور اہل حرفہ اور کھیتی مزدوروں کے بچّوں کو شام میں کلاس کھول کر ٹریننگ دینے کی کوشش کی جائے گی

(۷) مڈل اور اعلا ثانوی تعلیم : اقلیتی اسکولوں کے ٹیچروں کو ایس سی ای آر ٹی اور دوسرے مراکز اور ہدایتی اداروں کے ذریعہ دورانِ ملازمت، سائنس، ریاضی، سماجی سائنس، انگریزی اور رہنمائی روزگار کی ٹریننگ دی جائے گی۔

(۸)۔ ایس سی ای آر ٹی (اسٹیٹ کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ یعنی تعلیمی تحقیق اور تربیت کی ریاستی کونسل) اقلیتوں کے اداروں کے پرنسپلوں اور منتظموں کو جدید اسالیبِ تدریس کی تربیت دے گی۔

(۹) اقلیتی اداروں میں اصلاحی (ریمیڈیل) کوچنگ کی اسکیم۔ بارِ عمل ریاستی حکومت پر۔

(۱۰) ووکیشنل اور ٹیکنیکل تعلیم و تربیت : ان ہائر سکنڈری (اعلا ثانوی) اسکولوں میں جو پسماندہ اقلیتوں کو تعلیم دیتے ہیں، ووکیشنل کورس کھولے جائیں گے۔

(۱۱) ٹیکنیکل اور ووکیشنل ٹریننگ کے پروگراموں کا پورا فائدہ اقلیتی اداروں کو پہنچایا جائے گا۔

(۱۲) ان بلاکوں میں جہاں اقلیتوں کی گھنی آبادی ہے کرافٹ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کھولے جائیں گے جس میں ۴۰ فی صد نشستیں اہل حرفہ کے بچوں کے لیے محفوظ (ریزرو) کی جائیں گی۔

(۱۳) تعلیم نسواں : لڑکیوں کے اسکول کھولتے وقت استانیوں کے تقرر کے سمے، لڑکیوں کے ہوسٹل کھولتے وقت اور تعلیم نسواں کو نشہ دینے کے لیے یونیفارم اور دن کو کھانا دینے کی اسکیموں کو روبہ عمل لاتے ہوئے اقلیتوں کی ضروریات بتمام و کمال پوری کی جائیں گی۔

(۱۴) ان تمام اضلاع میں جہاں اقلیتوں کی گھنی آبادی ہے لڑکیوں کے لیے پروڈکشن

مع ٹریننگ مراکز کھولے جائیں گے جہاں تربیت کا کام بالعموم کو دیا جائے گا۔

(۱۵) **تعلیم بالغان اور ابتدائے طفولیت کی تعلیم:** تعلیم بالغان اور تعلیم ابتدائے طفولیت میں رضاکارانہ کوششوں کو بیدار کرنے کے لیے پیشہ وروں یا ماہرین کی تربیت۔

(۱۶) **لائبریریاں ریڈنگ روم:** گھنی اقلیتی آبادیوں میں لائبریریوں، ریڈنگ روموں کے قیام کی ہمت افزائی۔

(۱۷) **اقلیتی تعلیمی ادارے:** اقلیتی تعلیمی اداروں کو بلا تاخیر تسلیم کرنے کے لیے واضح ہدایات اور پالیسی۔

(۱۸) پروگراموں کی بجاآوری پر نگاہ رکھنے کے لیے مؤثر انتظامات۔

(۱۹) ہر ریاست میں اقلیتی اداروں کے ایک فیڈریشن کا قیام جس کے ذریعہ تعلیم کی ترقی کے اقدامات میں اقلیتی اداروں کا تعاون حاصل کیا جا سکے، اور ان اداروں میں ضروری اور رنیونتم انفراسٹرکچر مہیا ہو، تعلیمی معیار اونچا رکھا جائے اور اساتذہ کے مفادات کا تحفظ کیا جائے۔ ان فیڈریشنوں کو سرکاری طور پر تسلیم کیا جائے گا، اور انھیں امداد دی جائے گی۔

(۲۰) **وظائف وغیرہ کی اسکیم:** کمزور طبقات کو صلاحیت اور ضرورت کی بنیاد پر وظائف دیے جائیں اور اس کے ساتھ ساتھ انھیں اچھے تعلیمی اداروں میں داخلہ دلایا جائے۔ فیس کی معافی، فیس میں رعایت اور اہلِ حرفہ وغیرہ کو تعلیم کے لیے روزگار یا پیشہ سے ہٹانے کی مالی تلافی

(۲۱) **تعلیمی اور انتظامی مسایل:** وقفوں کے ساتھ تحقیقی مطالعات جن کا مقصد یہ ہوگا کہ جو اصلاحی اقدامات (اقلیتوں کی تعلیم کی بابت) کیے گئے ہیں ان کو بہتر اور موثر بنایا جائے، خصوصاً اقلیتوں کی گھنی آبادی کے علاقوں میں اسکولوں کی موجودگی کے تعلق سے۔

(۲۲) بورڈ آف ایجوکیشن اور صلاح کار کمیٹیوں میں تعلیمی اعتبار سے پسماندہ اقلیتوں کی نمایندگی۔

(۲۳) مذکورہ بالا اقدامات مؤثر طور پر عمل میں لائے جاتے ہیں یہ دیکھنے کے لیے مرکز اور ریاست کے تعلیمی شعبوں میں ایک ایک سیل یا چھوٹا شعبہ کھولا جائے گا

یہ سب کے سب اقدامات ایسے تھے جنھیں ملک نے منظور کیا، ریاستی حکومتوں کے متعلقہ وزراء نے تسلیم کیا اور جن پر پارلیمنٹ نے اپنی منظوری کی مہر لگائی لیکن ہوا کیا؟۔ نہ ریاستوں نے ان پر عمل کیا، نہ مرکز نے پروا کی۔ احتساب یا مانیٹر کرنے کی کسی کو فکر ہی نہیں ہوئی، قوم اپنی جگہ مطمئن، مسلمان اپنی جگہ شادمان کہ وطن عزیز ہماری پسماندگی سے پریشان ہے اور اس نے ٹھانی ہے کہ ہمیں ذلت

سے نکال کر دم لے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ ہمارے اس بیان کو مبالغہ سمجھیں۔ ہم قارئین کا دھیان اس طرف دلانا چاہتے ہیں کہ جولائی ۱۹۹۰ء میں مرکزی سرکار نے ایک گروپ اقلیتوں کی تعلیم کے بارے میں بنایا۔ مقصد یہ تھا کہ نئی تعلیمی پالیسی پر چار سال بیت چکے، دیکھیں تو اس اثنا میں اقلیتوں پر کیا بیتی۔ گروپ کے صدر شروع میں آر کے سید صاحب (جو فی زمانہ لسانی اقلیتوں کے کمشنر ہیں) تھے اور بعد میں سید حامد۔ اراکین میں پروفیسر رئیس احمد قرۃ العین حیدر صاحبہ، ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، سید حامد، ڈاکٹر خلیق انجم، جی این مصر اصناف، شری ماتا پرشاد، پروفیسر مُطّلب، شری کھتّر شامل تھے۔ گروپ سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اقلیتوں کی تعلیم سے متعلق جملہ تجاویز و سفارشات پر غور کرے اور سرکار کو مشورہ دے کہ مستقبل قریب میں اس ضمن میں اسے کیا کیا اقدامات کرنے چاہییں۔ گروپ نے اپنی آخری رپورٹ جنوری ۱۹۹۱ میں وزیر تعلیم کو پیش کر دی۔

گروپ نے نمونہ کے طور پر چند ریاستوں (بہار اور یوپی) اور دہلی کی یونین ٹیری ٹری کی تعلیمی پالیسی کا جائزہ لیا۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ "عملی پروگرام" کی بیشتر سفارشات صفحات کے حصار سے باہر نہیں نکل سکیں۔ اسے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ بہت سے متعلقہ افسران سفارشات سے ناواقف تھے۔ وہ اقدامات جو "عملی پروگرام" میں قلمبند ہوئے بیشتر عمل کو ترستے رہے۔ یہ عذر اکثر کیا گیا کہ مرکزی حکومت اگر عمل آوری کی خواہاں تھی تو ریاستوں کو ضروری مالی امداد کیوں نہیں دی؟ چنانچہ اقلیتی بستیوں کو نہ تعلیمی ادارے دیے گئے، نہ لڑکیوں کے لیے ہوسٹل کھولے گئے، نہ ان کے لیے یونیفارم اور دوپہر کے کھانے کا انتظام ہوا، نہ کرافٹ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کھلے، نہ کمیونٹی پالیٹیکنیکوں نے مجوزہ سمت میں کوئی قدم بڑھایا۔ نہ آئی ٹی آئی میں اہل حرفہ کے بچوں کے داخلے کا کوئی انتظام ہوسکا (داخلے پہلے کی طرح ہائی اسکول کے نمبروں کے حساب سے ہوتے رہے) نہ اقلیتی تعلیمی اداروں کو منظوری ملنے میں کوئی سہولت ہو پائی، نہ ان کے فیڈریشن کو حکومت سے منظوری یا مدد ملی، نہ اُترپردیش میں اردو کو بحال کرنے کے لیے کوئی قدم اٹھایا گیا، سوائے اس اعلان کے کہ اسے بھی بعض مقاصد کے لیے ایک سرکاری زبان کی حیثیت دی جائے گی۔ سہ لسانی فارمولے سے اردو اسی طرح بیرون در رہی۔ بڑی رسوائی کے ساتھ اپنے گھر سے نکالی گئی، نہ ہی اقلیتوں کو بورڈ آف ایجوکیشن وغیرہ میں نمائندگی دی گئی، نہ نگرانی یا مانیٹرنگ کا کوئی معقول انتظام مرکز یا ریاستوں میں ہو پایا۔ اردو نصابی کتابوں کی دستیابی جوئے شیر لانے کی طرح ضرب المثل بن گئی، اردو اساتذہ کی تربیت اسی طرح محروم التفات رہی، وظائف کا بھی کوئی اہتمام نہ ہو پایا۔

ستم بالائے ستم، جس گروپ کو ہدایت کی گئی تھی کہ ایسی سفارشات کرے جن پر مستقبل قریب میں عمل کیا جاسکے، اس کی رپورٹ ڈیڑھ سال ہوئے باریاب

ہو چکی ہے۔ (عبوری رپورٹ کو دو سال ہونے کو آئے) اس پر کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔

اقلیتوں کی فلاح کے لیے مسز گاندھی نے پندرہ نکاتی پروگرام بنایا تھا۔ انوکھی بات یہ ہے کہ وہ بات جو اقلیتوں کے لیے سب سے زیادہ ضروری ہے، یعنی تعلیم، اس کا پندرہ نکاتی پروگرام میں سرے سے تذکرہ ہی نہیں۔ گویا جنھیں جہالت راس آگئی ہو انھیں تعلیم سے جراحت کیوں پہنچائی جائے۔ ٹریننگ کا اہتمام البتہ کیا گیا تھا، بارہویں نکتہ میں وعدہ کیا گیا کہ "جن علاقوں میں اقلیتوں کے افراد کی کثرت ہے وہاں حکومت یا نجی ایجنسیوں کے ذریعہ آئی ٹی آئی (انڈسٹریل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ) اور پالی ٹیکنیک کھولے جائیں تاکہ ان اداروں کے داخلوں میں اقلیتوں کی مناسب نمایندگی ہوسکے"

بارہویں نکتہ پر عمل کس طرح کیا گیا؟ اوّل تو اس وضع کے ادارے مسلمانوں کی بستیوں میں یا ان کے قریب کھولے ہی نہیں گئے۔ اور اگر کھولے بھی گئے تو ان میں مسلمانوں کو داخلہ نہیں ملا۔ کیونکہ داخلہ کی شرطوں میں ترمیم کی طرف کسی کا دھیان ہی نہیں گیا۔ اس سادگی پہ کون نہ مرجائے کہ ادارے کے قرب کو صلاحیت میں اضافہ کا مترادف سمجھا جارہا ہے۔ نمبروں کی بنیاد پر داخلے دیے گئے تو مسلمان بچے داخل ہونے سے رہے۔ ہمارے ارباب اختیار کے یہ بات ابھی تک ذہن نشین نہیں ہوسکی کہ اس تیز رفتار زمانہ میں ان لوگوں کو جو پیچھے رہ گئے ہیں دھکّہ دے کر آگے نہ بڑھایا گیا تو وہ اور پچھڑ جائیں گے۔ دھکّہ دیا جاسکتا ہے اسکولوں کی ہمت افزائی کرکے، داخلوں میں ضروری تحفظات کے ذریعہ اور ان مخصوص مسائل کو حل کرکے اور ان رکاوٹوں کو دور کرکے جو مسلمانوں کی تعلیم کی راہ میں حائل ہوگئی ہیں۔

اقلیتی اسکولوں کے اُن اساتذہ کی تربیت کے لیے جو کلیدی مضامین پڑھاتے ہیں این سی ای آر ٹی نے پانچ یونی ورسٹیوں کو بطور ریسورس سینٹر کے چنا۔ ان میں سے کشمیر یونی ورسٹی اور عثمانیہ یونی ورسٹی نے یہ "بے گار" اپنے ذمّے لینے سے صاف انکار کردیا۔ جامعہ ملیہ نے بے دلی کے ساتھ ایک آدھ کورس کرایا۔ علی گڑھ نے البتہ دلچسپی لی لیکن نہ اتنی جس کی توقع تھی۔ اور اب وہ اسکیم ہی کھٹائی میں ڈال دی گئی۔ ہم احتجاج کریں تو کس زبان سے۔ اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست۔ (اے بادِ صبا یہ سب کچھ تیرا ہی لایا ہوا ہے) پیمان شکنی ضرور ہوئی لیکن اس کے لیے حکومت کے ہاتھ کس نے مضبوط کیے؟ اس پر این سی ای آر ٹی کو آمادہ کس نے کیا؟ یاد رکھیے، سرکار کا محبوب مشغلہ سدا پیمان شکنی ہوتا ہے، پیمان شکنی کا ہدف وہی بنتا ہے جو سوجھ بوجھ سے بیگانہ، تنظیم سے ناآشنا، اتحاد سے بے بہرہ، اجتماعی بصیرت، ملی غیرت، عمل کی قوت سے نابلد ہو۔ یہ کسی جماعت یا

طبقہ کی غفلت کا خمیازہ ہوتا ہے جو مدام حکومت کی وعدہ خلافی اور ارباب اختیار کی پیماں شکنی کی شکل اختیار کرتا ہے۔ جس سے پیمان کیا جاتا ہے، وہ اگر ہوش و گوش رکھتا ہو، اس میں اگر دم ہو، اسے اپنے نفع نقصان کا شعور ہو، احساس تناسب اسے فروعات میں الجھنے سے بچاتا ہو تو پھر کسی حکومت کی مجال نہیں کہ اس سے کیے ہوئے وعدے پورے نہ کرے۔

اس سے بڑی بھول کیا ہوگی کہ ہم ہر چہار طرف تعلیم کا ظہور دیکھ رہے ہیں اور خود تعلیم حاصل نہیں کرتے۔ ٹکنولوجی جس سے ہم بے غیرتی کے ساتھ فائدہ اٹھا رہے ہیں علم ہی کی دین ہے۔ جس کے ذہن میں علم ہے اسی کے پاس طاقت ہے، ثروت ہے، دولت ہے، اختیار ہے۔ اور ہم ہیں کہ علم سے منہ موڑ کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ گویا جہالت کو ہم نے اپنی معصومیت کی ڈھال بنا لیا ہے۔ تنظیم، اتحاد اور شعور کسی جماعت کے پاس نہ ہو تو حکومت اس سے صرف وعدے کرتی ہے، اور کچھ نہیں کرتی۔ لیکن اس سے بڑی نادانی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہم اپنی جہالت کو دور کرنے اور مشکلات کو حل کرنے کے لیے حکومت پر تکیہ کریں اور اس زرّیں اصول سے جو جلی حروف میں آفاق پر لکھا ہوا ہے یعنی جو اپنی مدد آپ نہیں کرتا، خدا بھی اس کی مدد نہیں کرتا، عملاً گریز کرتے رہیں۔ یاد رکھیے حکومت اس کا رنگ خواہ کچھ بھی ہو، کبھی خود سے ہماری مدد نہیں کرے گی ہم خود اٹھیں گے تو وہ بھی ہماری مدد کے لیے آئے گی، ہماری مدد پر خود کو مجبور پائے گی۔

(۱۵ جون ۹۲ء)

خدمت اور خود اعتمادی

عیادت، بیمار پُرسی اور تیمار داری مذہب اور تہذیب کی نگاہوں میں عزیز اور محترم ہیں۔ اللہ کے آخری پیغمبر صؐ نے تو ان کی خاص ہدایت کی ہے۔ تیمار داری، ماہرانہ تیمار داری اس بات کا ثبوت ہے کہ میدانِ کارزار میں بھی انسان، خونریزی اور حملہ آوری کے دوران انسانیت، شرافت اور ہمدردی سے یکسر محروم نہیں ہوجاتا۔

تہذیب نے ترقی کی، لڑائیوں نے طول پکڑا، بیماریاں بڑھتی گئیں، پیچیدہ ہوتی گئیں۔ تیمارداری نے ہنر کی شکل اختیار کر لی، وہ ایک بہت ہی شریفانہ پیشہ بن گئی۔ جسے نرسنگ کا خوش آہنگ نام ملا۔ ہندستان میں بھی کئی جگہ نرسنگ کے لیے اسکول کھولے گئے، کالج قائم ہوئے۔ ہسپتالوں کے لیے نرسوں کی موجودگی اتنی ہی ضروری ہوگئی جتنی ڈاکٹروں کی۔ بیمار، ڈاکٹر اور نرس شفاخانوں کے ارکانِ ثلاثہ بن گئے اور ان کی تعداد میں ایک تناسب متعین ہوگیا۔ اتنے مریضوں پر ایک نرس، اتنی نرسوں پر ایک ڈاکٹر۔

نرسوں کا کام سخت ضرور ہے لیکن اس کی اپنی تلافیاں ہیں۔ اول تو اس سے زیادہ شریفانہ کوئی پیشہ نہیں جو بیماری، اور دکھ درد میں مجبوروں، معذوروں کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ ان کی تکلیف دور کرتا ہے۔ نرسیں بیماروں کا چیخنا، چلانا، کراہنا برداشت کرتی ہیں۔ ان کے رستے ہوئے زخموں کو دھوتی ہیں، مرہم پٹی کرتی ہیں۔ ان کے وہ کام بھی کرتی ہیں جن سے عام حالات میں کراہت ہو، گھن آئے۔ رات رات بھر جاگتی ہیں۔ ہم اس بحث میں نہیں پڑیں گے کہ وہ یہ سب کام خوشدلی سے کرتی ہیں یا بادلِ ناخواستہ، یا یہ کہ بعض نرسیں مریضوں کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کرتیں، اور مرض کی پیمایش کے سلسلہ میں بعض اوقات ان سے فرضی کارروائی بھی سرزد ہوجاتی ہے۔ انحرافات اور خلاف ورزیاں کس پیشہ میں نہیں ہوتیں۔ ان کے علاوہ انھیں گھر سے نکلنے، دنیا دیکھنے اور اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے موقع ملتے ہیں۔ اس طرح ان کی شخصیت کا نشوونما ہوتا ہے اور نظر میں وسعت آتی ہے۔

ہندستان کی آبادی اور ہسپتالی بستروں کو دیکھتے ہوئے نرسوں کی تعداد

کم ہے۔ لہذا ہسپتالوں میں تیمار داری میں کسر رہ جاتی ہے۔ ہمارے یہاں بہت دنوں تک یہ خیال عام رہا کہ نرسنگ اچھا پیشہ نہیں ہے۔ نرسوں کا واسطہ اپنے فرائض انجام دیتے ہوئے غیر مردوں سے پڑتا ہے جن میں مریض اور ڈاکٹر دونوں شامل ہیں۔ ہر پیشہ میں کچھ خطرات ہوتے ہیں، ان کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔ حیا حجاب احتیاط اور وقار آڑے وقتوں میں کام آتے ہیں۔ مسلمانوں میں چونکہ پردے کا رواج ہے، اور نامحرموں سے فاصلہ رکھنے کی تاکید ہے، اس لیے مسلمان لڑکیاں نرسنگ میں بہت کم آتی ہیں۔ حالانکہ ان کے یہاں نرسنگ کی روایت قرون اولیٰ تک پہنچتی ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ جن گھروں سے لڑکیاں نرسنگ میں گئی ہیں، وہاں کایا پلٹ ہوگئی ہے۔ ان گھروں میں روشنی اور خوشحالی، خود اعتمادی اور سرفرازی آئی ہے۔

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی نے اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے ایک نرسنگ اسکول کھولا۔ ایک دوسرا نرسنگ اسکول دلّی میں جامعہ ہمدرد کے زیر اہتمام چل رہا ہے۔ دونوں جگہ اس دشواری کا سامنا کرنا پڑا کہ مسلمان لڑکیاں نرسنگ اسکول میں داخلہ لینے سے گریز کرتی ہیں۔ لڑکیاں چاہتی بھی ہیں تو والدین اجازت نہیں دیتے، وہ سوچتے ہیں کہ لڑکی نرس بن گئی تو خاندان کی ناک کٹ جائے گی۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ آج کل لڑکوں کے مطالبات کی کوئی حد نہیں۔ بیٹی کے ہاتھ میں ہنر نہیں ہوگا تو اس کی شادی کیونکر ہوگی۔ ہزاروں لڑکیاں اسی طرح بن بیاہے بیٹھی رہ گئی ہیں۔ ظالم سماج اس پر نکتہ چینی کرنے لگتا ہے۔ پھر ماں باپ ہمیشہ بیٹھے نہیں رہیں گے، وہ چلے جائیں گے تو بن بیاہی لڑکیاں کہاں جائیں گی، کیسے گزر کریں گی۔ لہذا ماں باپ کو چاہیے کہ اپنی بچیوں کو صحیح تربیت دیں، اخلاق و کردار کے بنیادی اصولوں کو ان کی طبیعت میں پختہ کر دیں، اور انھیں وہ ٹریننگ دلادیں، جس سے حلال روزی کی کنجی ان کے ہاتھوں میں آجائے، خواہ اس کا ذریعہ وہ دستکاری ہو جو گھر بیٹھے کی جاسکتی ہے یا وہ کام جو باہر نکل کر کیے جاتے ہیں، جیسے معلمی، نرسنگ، فارمیسی، طب، وکالت، سرکاری ملازمت، دفتری کام، صحافت، داخلی تزئین، انجینیرنگ، آرکیٹکچر (فن تعمیر)، تجارت، صنعت و حرفت۔ انھیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ماؤں کی شخصیت، ان کا عزم و آہنگ ان کی فراست اور حکمتِ عملی فروغ پاتی ہے تو اس کا فائدہ براہ راست بچوں کو پہنچتا ہے۔ اگر مائیں باخبر، پُر اعتماد، خود دار اور ہنرور ہوتی ہے تو بچے بھی ان ہی خطوط پر اٹھتے ہیں۔ مائیں خواب دیکھتی ہیں، بچے ان کی تعبیر کرتے ہیں۔

اور پھر یہ بات تو ہم سب کے سوچنے کی ہے کہ ہر ملک کو لازمی ہنر پیشہ افرادی طاقت کی ضرورت رہتی ہے، اس میں سب سے اہم وہ افرادی طاقت ہے جس کا رُوئے سخن صحت اور تعلیم کی طرف ہوتا ہے۔ لہذا آبادی کے ہر حصّہ

ہر گروہ، ہر جماعت، ہر قوم کو اہم اور لازمی افرادی طاقت کی فراہمی میں حصہ ضرور لینا چاہیے۔ یہ بات اوروں کی طرح مسلمانوں پر بھی واجب ہے۔ ورنہ ان پر یہ الزام آئے گا کہ وہ اپنے وطن کی ترقی کی طرف سے غافل ہیں۔ صحت کے ضمن میں ڈاکٹری آتی ہے، یونانی اور دیسی طب آتے ہیں، فارمیسی اور پیرا میڈیکل کورسیز آتے ہیں اور نرسنگ آتی ہے۔ اس وقت ہم صرف فارمیسی اور نرسنگ کی بات کریں گے دئیے ہیں، واقع جامعہ ہمدرد (ہمدرد یونی ورسٹی) نے ملک اور ملت کی ضروریات کو ملحوظ رکھتے ہوئے فارمیسی (ڈپلوما اور بی فارما) اور نرسنگ کی تعلیم کا اہتمام کیا ہے۔ فارمیسی میں جدید فارمیسی کے علاوہ یونانی فارمیسی کی اسناد بھی دی جاتی ہیں۔ یونانی فارمیسی میں جدید فارمیسی کے سارے پرچے شامل ہوتے ہیں، یونانی دواسازی کے پرچے ان پر مستزاد۔ ان طلبہ اور طالبات کے لیے جو یونانی فارمیسی میں ڈپلوما یا ڈگری حاصل کرتی ہیں، جدید فارمیسی کی ساری راہیں بھی کھلی رہتی ہیں یہ زرّیں موقع ہے۔ جس کا فایدہ مسلمان طلبہ اور طالبات کو اٹھانا چاہیے۔ فارمیسی کے ڈپلوما اور بیچلر دونوں کورسوں کے لیے ۱۰+۲ پاس کرنا شرط ہے اور وہ بھی اس طرح کہ فزکس کمسٹری اور بایولوجی کے مجموعی نمبر ۵۰ فیصد یا اس سے زیادہ ہوں۔ عمر ۱۷ اور ۲۵ سال کے درمیان ہو۔ یونانی فارمیسی میں داخلے کے لیے اردو میں میٹرک جیسی صلاحیت درکار ہوگی۔

اس وقت جدید فارمیسی کے سارے کورسیز میں جنھیں ہمدرد یونی ورسٹی چلا رہی ہے، مسلمان طلبہ اور طالبات کی تعداد بہت کم ہے، حالانکہ ایسے کورسوں میں شدید ضرورت مسلمانوں کی شرکت کی ہے۔ وہ اکثر ان مواقع سے بے خبر رہتے ہیں، اور خبر ملتی ہے تو محنت ساتھ نہیں دیتی۔ یونانی فارمیسی سے جو راہ کھلی ہے اس پر بھی وہ یکسوئی اور ریاضت کے ساتھ قدم نہیں رکھ رہے۔ انگریزی مثل ہے کہ گھوڑے کو پانی تک لا تو سکتے ہیں لیکن اسے پانی پینے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ نرسنگ کے کلاس میں ان کا تناسب اور بھی کم ہے حالانکہ کمزور طبقہ کی مسلمان نرسنگ طالبات کو ۲۰۰ روپے ماہانہ کے اس وظیفہ کے علاوہ جو ہمدرد یونی ورسٹی دیتی ہے ۱۵۰ روپے ماہوار کا اضافی وظیفہ ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کی طرف سے دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر سال کوشش کی جاتی ہے کہ مسلمان لڑکیاں نرسنگ میں داخلے کے لیے درخواست دیں۔

فارمیسی اور نرسنگ میں داخلہ کے لیے ہر سال عام طور پر مئی میں اشتہار نکلتے ہیں اور امیدواروں کو داخلہ کے امتحان کے لیے جون میں بلایا جاتا ہے۔

تو اب اگلے سال ہی اٹھایا جاسکتا ہے (یہ اور بات ہے کہ فارمیسی کے داخلہ کا نوٹس مختلف اخباروں میں کئی ماہ پہلے شائع ہو چکا ہے۔) نرسنگ کے لیے ابھی موقع ہے

کیا عجب کہ وہ قارئین جو کمزور طبقات کی فلاح میں دلچسپی رکھتے ہیں اس خبر کو اپنے گرد و پیش میں مشتہر کر دیں۔ تاکہ ان مسلمان لڑکیوں کو جن کی نگاہ جامعہ ہمدرد کے اعلانات پر نہیں پڑی، والدین سے مشورہ کرنے اور درخواست دینے کا موقع مل جائے۔ جامعہ ہمدرد میں نرسنگ طالبات کے قیام کا انتظام ہے۔ وہ غیر شادی شدہ خواتین جن کی عمر ۱۷ اور ۲۲ سال کے درمیان ہے اور جنھوں نے بارہویں جماعت کا امتحان پاس کیا ہے، رُفیدہ اسکول آف نرسنگ میں داخلہ کے درخواست دے سکتی ہیں۔ جن لڑکیوں نے سائنس سے "پلس ٹو" کیا ہے اور جنھیں ۵۰ فی صد یا اس سے زیادہ نمبر ملے ہیں انھیں ترجیح دی جا سکتی ہے۔ درخواستیں رجسٹرار جامعہ ہمدرد ہمدرد نگر، نئی دہلی ۶۲ کے نام آنی چاہییں۔ اگر ہم لوگ معقول تعداد میں درخواست ہی نہ دیں تو پھر اس کی شکایت بے جا ہوگی کہ ہمیں منتخب نہیں کیا جاتا۔ نرسنگ کے کم اور فارمیسی کے بہت سے کالج ایسے ہیں جہاں مسلمان لڑکیاں داخلہ کے لیے درخواست دے سکتی ہیں، فارمیسی کے لیے مسلمان لڑکے بھی۔ ہم بہت پچھڑ گئے ہیں لہٰذا ہمیں تلف کیے ہوئے وقت کی تلافی بھی کرنی ہے۔

(۲۷ جولائی ۹۲ء)

حکمراں کی ساحری

جادو ٹونے کی داستانیں پرانی اور فرسودہ ہوچکیں۔ جادو کو اب مانتے وہی ہیں اور اس سے اثر بھی وہی لوگ لیتے ہیں جو خود کوئی دم خم نہیں رکھتے، جو ریڑھ کی ہڈی سے محروم ہوتے ہیں، جنھیں حالتِ انفعال میں رہنے کی وجہ سے جادو کا ہدف اور ہپناٹزم کا شکار بننے میں لطف آتا ہے، جنھیں خواب سے بیدار کیا جاتا ہے تو حکمراں کی ساحری انھیں پھر سلا دیتی ہے، جنھیں کوئی حیات وموت کے مسائل بتانے چلے تو ان میں سے افلاطون اور بقراط اُٹھتے ہیں اور خلطِ مبحث کے لیے شخصیات کی بے مصرف اور بے ربط بحث چھیڑ دیتے ہیں۔ چنانچہ راقم سطور کی گزارشات کے ساتھ اکثر یہی ہوا ہے۔ چند مہینوں کی بات ہے اس نے "کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں" کے عنوان سے پھر فریاد کی تھی۔ اس مضمون کا مدعا، اس کا رُخ، اس کا جھکاؤ یہ تھا کہ ملک کا کوئی طبقہ اگر جاہل، غافل اور سادہ لوح اور اونچ نیچ اور اپنے بھلے بُرے سے ناآشنا ہو تو حکومت اُسے متواتر فریب دیتی رہتی ہے، بچوں کو کھلونے دے کے جس طرح بہلایا جاتا ہے، وہی طریقہ اس طبقہ یا ملت کے ساتھ اختیار کرنے میں سرکار کو باک نہیں ہوتا جس وضع کے کھلونوں کا مذکورہ مضمون میں ذکر تھا، وہ گوشت پوست کے انسانوں کے لیے تھے جنھیں بڑے بڑے لیکن بے اثر اور بے فیض مناصب دے کر بہلاوے کا کام لیا جاتا ہے۔

آج ایک دوسری قسم کے کھلونوں کا ذکر کیا جائے گا۔ یہ ہیں وہ اعلان جو حکومت پسماندہ اقلیت کی تالیفِ قلب کے لیے وقفوں کے ساتھ کرتی رہتی ہے۔ چناؤ ہونے والا ہو یا مطلع پر اس کے امکانات روشن نظر آنے لگے ہوں، یا ارتقائی منصوبہ بنایا جارہا ہو، یا اقلیت کے ساتھ کوئی زیادتی ملحوظِ خاطر ہو تو اس کا دھیان بٹانے یا دل بہلانے کے لیے خوشنما اور دل خوش کُن اعلان کیے جاتے ہیں۔ انھیں فردوسِ گوش پاکر نادان ملت وجد کرنے لگتی ہے۔ بھول جاتی ہے کہ صندوق اندر سے خالی ہو تو بیرونی آرائش سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ سوائے خوش فہمی اور خود فریبی کے۔

مرکزی وزیر فلاح نے شاید یہ محسوس کرتے ہوئے کہ مسلمانوں کو اپنے پچھڑے پن کا احساس ہو چلا ہے اور اس کی طرف سے وہ بے اطمینان اور بدخط ہونے لگے ہیں، ابھی چند روز ہوئے پندرہ نکاتی پروگرام کو جادو کی چھڑی کی طرح استعمال کیا ہے۔

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا۔ مدعا اس کے سوائے کیا ہوسکتا ہے کہ مسلمان جو کُنمنا رہے ہیں، کروٹ لے کر پھر سو جائیں یا اگلے عام چناؤ میں جب ووٹ ڈالنے جائیں تو کانگریس کے تئیں ان کے دل میں خیرسگالی کے جذبات موجزن ہوں۔ ہم اپنی سادہ لوحی کی طرف نظر کرتے ہیں تو یقین آجاتا ہے کہ یہ مدّعا پورا ہوگا۔ ایسا ایک عرصہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔ ایک حدیثِ لطف، ایک خوشنما اور خوش گوار اعلان ہماری شکایتوں کو دھو ڈالنے اور ہماری ٹمٹماتی ہوئی آنکھوں کو موندنے کے لیے کافی ہے۔ ہمیں دراصل ملتا وہی ہے جس کے ہم سادہ لوحی کے لحاظ سے مستحق ہیں، آبادی کے لحاظ سے نہیں۔

ذرا سوچیے، مسز گاندھی کے پندرہ نکاتی پروگرام سے سب سے بڑی اور سب سے پسماندہ اقلیت کو کیا ملا؟ اس کی حالت میں بہتری کی طرف کوئی تبدیلی ہوئی؟ جن مقاصد اور عزائم کا اس پروگرام میں ذکر ہے ان کو لاگو کیا بھی گیا؟ تعمیل اور عدمِ تعمیل کا تخمینہ لگایا بھی گیا؟ پندرہ نکاتی پروگرام اور اس کے نفاذ میں کیا خامیاں دریافت ہوئیں؟ جن لوگوں کے فائدہ کے لیے یہ پروگرام وضع کیا گیا تھا ان کو نفاذ یا احتسابِ نفاذ میں شریک بھی کیا گیا؟ آپ کو حیرت ہوگی کہ یہ سارے سوالات ایک "ہاں" کو ترس رہے ہیں، ان سب کے جواب منفی ہیں۔

وزیرِ محترم نے اس بات کا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا جو مسلم اقلیت کے لیے سب سے زیادہ ضروری ہے۔ وہ شئے کیا ہے؟ جس سے یہ سوال کیا جائے گا وہ چھوٹتے ہی جواب دے گا، تعلیم۔ ستم یہ کہ مسز گاندھی نے بھی اپنے پندرہ نکاتی پروگرام میں تعلیم کو جگہ نہیں دی تھی۔ کیا ہمارا وطن عزیز ہمیں جاہل رکھنے میں عافیت یا منفعت دیکھتا ہے؟ مان لیا کہ وہ دیکھتا ہے، پھر آخر ہم کیوں دیکھتے ہیں۔ ہم نے زمین آسمان ایک کیوں نہیں کر دیا کہ خدارا ہمیں جہالت سے چھڑانے کا اہتمام کیجیے، عام تعلیمی نظام کے علاوہ ہمیں خصوصی تعلیمی توجہ درکار ہے۔ ہم نے تو کبھی یہ بات سوچی بھی نہیں ہمارا دھیان بھی اس طرف نہیں گیا۔ ہماری قیادت کے لبوں پر گزشتہ ۴۴ سالوں میں اس کا شکوہ بھی نہیں آیا۔ ہم نے سرکار کی اس بڑی لغزش، اس کے اس نقصان رساں سہو کو احتجاج کا خراج بھی ادا نہیں کیا۔ بار بار ذہن اس انہونی، اس ناقابلِ یقین تشویش کی طرف جاتا ہے کہ حکومت اور اقلیت کے درمیان سازش ہوئی ہے کہ اقلیت کو اُبھرنے اور آگے بڑھنے نہ دیا جائے، حکومت اعلان کرتی رہے، عمل نہ کرے، اقلیت اعلان سنتی رہے، باز پُرس نہ کرے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ پر خوش، ایک ووٹ بینک کی طرف مطمئن۔ دوسرے کو یہ اطمینان کہ وہ سکونِ خاطر جو بے عملی کی آسائش نے فراہم کر دیا ہے، برہم نہیں ہوگا۔ اللہ اللہ خیر سلّا۔

(اگست ۹۲ء)

دھرماندھ

ہم لوگ لکھنؤ سے آل انڈیا اردو کانفرنس میں شریک ہو کر دہلی واپس آرہے تھے۔ یہ کانفرنس یو پی کی اردو رابطہ کمیٹی نے کی تھی۔ اندر کمار گجرال صاحب نے حسبِ معمول موضوع سے ذرا اوپر اٹھ کر کہا کہ خطرہ صرف اردو کو نہیں ہے اس وقت ہندستان کے سیکولر کردار اور اس کی مذہبی رواداری کے لالے پڑ گئے ہیں، لہٰذا ہمیں اُن عناصر کے خلاف متحد ہو کر صف آرا ہو جانا چاہیے جو جمہوری اور سیکولر اقدار کو مسمار کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ بات خدا لگتی تھی۔ کھچا کھچ بھرے ہوئے کو آپریٹو ہال کو اس نے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ سوچنے کی بات بھی ہے، اور سوچنے کے بعد کچھ کرنے کی۔ بھاجپا نے سب سے بڑی اقلیت پر ہر طرف سے یلغار شروع کر دی ہے اور یہ یلغار سالہا سال کی تیاریوں کا نتیجہ ہے۔ مسلمانوں نے بھاجپا، آر ایس ایس اور وشو ہندو پریشد کی با مقصد تنظیم کا جواب بڑھتے ہوئے انتشار اور نفاق سے دیا ہے۔ بابری مسجد سے متعلق ایکشن کمیٹیوں کے رہنما کبھی کبھی مل بیٹھتے ہیں، کبھی وزیر اعظم سے، کبھی دوسرے فریق سے ملاقاتیں کرتے ہیں، کبھی چندہ جمع کرتے ہیں اور مقدمہ لڑتے ہیں۔ انھوں نے خطرہ کو محسوس ہی نہیں کیا۔ انھوں نے کوئی کوشش عوام کو باخبر اور منظم کرنے کی نہیں کی۔ انھوں نے ان کی تعلیم، تربیت اور آگاہی کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ اپنی سادہ لوحی میں وہ سمجھ بیٹھے کہ یہ مسئلہ صرف ایک مسجد کا ہے، انھیں آہٹ بھی نہ ملی کہ یہ مسئلہ مسلمانوں اور ان کی مسلمانی اور ان کے تمدن کی بقا کا ہے۔

جس بھونڈے طریقے سے انھوں نے اس نزاع کو برتا ہے، اس نے مسلمانوں کے جان و مال اور جان و مال سے بڑھ کر ان کے حوصلہ اور اعتماد کو زبردست نقصان پہنچایا ہے سوال ہوتا ہے کہ اب تک مسلمانوں کو حاصل کیا ہوا اور کیا حاصل ہونے کی امید ہے جس کی بنا پر وہ سارے تعمیری اور فلاحی کاموں کو چھوڑ کر ایودھیا کے نزاع کا طواف کر رہے ہیں؟ ملا تو کچھ نہیں اور ملے گا بھی کچھ نہیں۔ جن کے پاس نہ تنظیم ہو نہ اتحاد، نہ دور اندیشی، نہ احساسِ تناسب، نہ ہوشمندی، اُن کی قسمت میں شکست لکھی ہوئی ملے گی۔ ۱۹۴۹ میں بابری مسجد میں جبراً مورتیاں رکھ دی گئیں اور اس کا دروازہ مسلمانوں پر بند

کر دیا گیا۔ مسجد کو گویا زبردستی مندر بنا دیا گیا۔ کیا اس طویل عرصہ میں ہم نے کوئی موثر کوشش مسجد کی بازیابی اور بحالی کے لیے کی۔ کیا مطالبہ کر کے عدالت کو فیصلہ کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا؟ یاروں کا اب جو منصوبہ ہے وہ بھی ظاہر ہے۔ مسجد کو محاصرہ میں لے لیا جائے۔ اس کے آس پاس نہ کوئی اہلِ ایمان نہ کوئی پرندہ پھٹک سکے، نہ پَر مار سکے۔ پھر چاہے مسجد شہید کی جائے یا غفلت اور بادِ باراں اور خندق کی نذر کر دی جائے، برابر ہے۔ وزیر اعظم مذاکرات کر رہے ہیں۔ وقت گزرتا جا رہا ہے، بابری مسجد پر انتہا پسند ہندو جماعتوں کا تسلط اور تصرف دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ کوئی صورت اب مسجد کی بازیابی کی نہیں ہے۔ ظالموں نے بزورِ اکثریت اس پر قبضہ کر لیا ہے اور ہندو عوام کو اپنا ہم خیال بنا لیا ہے۔ حکومت کی حکمتِ عملی بھی شاید یہی ہو کہ نگاہوں سے اوجھل ہو جانے دو۔ آنکھ اوٹ پہاڑ اوٹ۔ چاروں طرف دیواریں کھنچ جائیں گی تو مسجد کیسے نظر آئے گی۔

ایودھیا کے نزاع نے مسلمانوں کو توڑ دیا ہے۔ ان کی قیادت اور زیادہ بے حس اور بے اثر شکل میں گئی ہے۔ اُسے اس کی کوئی فکر نہیں کہ مسلمان تعلیم میں اور پچھڑ گئے ہیں۔ منصوبائی ارتقا میں انھیں برائے نام حصہ ملا ہے۔ جو پروگرام حکومت نے ان کی پسماندگی دور کرنے کے لیے بنائے وہ کاغذ سے آگے نہیں بڑھے۔ ان کی سماجی حالت ابتر ہو گئی ہے۔ سرکاری ملازمتوں میں ان کا تناسب گھٹتا جا رہا ہے، اہلِ حرفہ کی اقتصادی حالت بگڑ رہی ہے۔ زوال کے ان سب اسباب کی طرف کسی کا دھیان جاتا ہی نہیں، ذکر ہوتا ہے تو بابری مسجد کا، فکر ہوتی ہے تو اس کی بازیابی کی جو اب دائرہ امکان سے نکل چکی ہے اور آرزو کی جاتی ہے تو حکومت کے قرب، ریاست کے صرفہ پر سیاحت کی۔ ٹرین میں ہمارے ساتھیوں میں سے کسی نے اس تباہی کا ذکر کیا جس سے ایودھیا تنازعہ کے باعث مسلمان دوچار ہو گئے ہیں۔ ایک ہندو سجن نے جو اسی ڈبے میں بیٹھے ہوئے تھے، کہا کہ آپ سے زیادہ نقصان ہندو قوم کا ہوا ہے۔ میں نے دریافت کیا "کیسے"، جواب ملا "دھرماندھ کی شکل میں۔ اس جھگڑے نے ہندوؤں کو سولھویں صدی میں ڈال دیا ہے"، تب میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ نقصان واقعی صرف مسلمانوں کا نہیں ہوا، ہرچند کہ سب سے زیادہ انھی کا ہوا، بلکہ ہندوؤں کا بھی نقصان ہوا اور ہمارے وطن کا بھی۔ دھرماندھ سے زیادہ ہلک کوئی بیماری نہیں ہوتی۔ مذہب جب جنون کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو پھر کچھ نظر نہیں آتا۔ بھلائی کی کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ دھرماندھ کا ترجمہ مذہبی تعصب یا مذہبی جنون کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان دونوں میں دھرماندھ کا سا زور نہیں۔ دھرم اگر اندھا کر دے تو انسان بلا دھرم کے بہتر۔ مذہبی تعصب سے خدا بچائے۔

مذہب یا دین بھلائی سکھاتا ہے، برائی اور عداوت سے دور رکھتا ہے، اور ہمارے یہاں دھرم اور دین کو توڑ مروڑ کر برائی، ناانصافی، عداوت اور کج روی کا آلۂ کار بنایا جا رہا ہے۔

مسلمانوں کے تعصب کی تاویل اس طرح کی جاتی تھی کہ وہ نرغہ میں ہیں، ان کی حیثیت ۳۲ دانتوں میں ایک زبان کی سی ہے، وہ اقلیت میں ہیں۔ اور اکثریت کی طرف سے خطرہ محسوس کر رہے ہیں، اس لیے وہ اپنے دفاع میں علاحدگی، تنہا روی، جذباتیت اور کدورت کو بروئے کار لا رہے ہیں۔ اس وقت مسلمان خاموش ہیں، سب کچھ برداشت کر رہے ہیں۔ ان کی قیادت امن و امان قائم رکھنے کے حق میں ہے اور نرالی بات یہ ہے کہ اب اکثریت جسے کسی قسم کا خوف نہیں ہے، مذہبی جنون کے درجۂ حرارت کو تیز کرتی چلی جا رہی ہے۔ یہ لوگ جو رواداری، وسیع الخیالی اور فراخ مشربی کا دعوا کرتے تھے، جوشِ عداوت میں ان اوصاف کو بہت پیچھے چھوڑ چکے ہیں۔ اس وقت ملک میں دھرماندھ کا بول بالا ہے۔ اس کے پاس ادارے ہیں "کاڈر" ہے اسکولوں اور شاکھاؤں کا جال ہے، منصوبے ہیں اور ان کو عمل میں لانے کی شکتی ہے۔ مسلمانوں کے پاس نہ کوئی کاڈر ہے، نہ تعلیمی نظام، نہ تربیتی کیمپ، نہ اتحاد نہ منصوبہ۔ ملک کی روشن خیال جماعتوں کے پاس سوائے مسلمانوں سے ہمدردی کے اور کیا ہے۔ ان میں اس کی سکت نہیں کہ دھرماندھ کے طوفان کا مقابلہ کر سکیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ابھی وہ سچائی یا گہرائی کے ساتھ اس کی ضرورت بھی محسوس نہیں کر رہی ہیں۔

دھرماندھ سے لڑنا ملک اور ملّت دونوں کے لیے ضروری ہے۔ دھرم آنکھوں کو روشنی دینے کے لیے ہے، بے نور کرنے کے لیے نہیں۔ جو اُسے بے نور کرنے کے لیے استعمال کرے گا، وہ اُسے اپنے محور اور مقصد سے ہٹا دے گا، اس کا اپمان کرے گا۔ مسلمانوں کو خود بھی مذہبی تعصب سے بچنا چاہیے اور دوسرے مذہب والوں کے ساتھ مل کر اس مذہبی جنون کا مقابلہ کرنا چاہیے جس نے اس وقت اکثریت کے ایک بڑے حصّے میں اپنا زہر بھر دیا ہے۔ اس وقت مسلمانوں کے وہ لیڈر بھی جن سے انتہاپسندی منسوب کی جاتی تھی، اعتدال، احتیاط، انضباط اور توازن سے کام لے رہے ہیں۔ خدا کرے وہ اس روش پر قائم رہیں۔ اب اکثریت کو اس روش پر لانا ہے۔ اکثریت اگر ہاتھ سے گئی، اگر اس نے رواداری کے بجائے زبردستی اور ستم شعاری کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تو اس ملک کا اور اس کی سالمیت اور تہذیب اور امن و امان اور ترقی کا خدا حافظ ہے۔

لیکن کام خواہش کرنے سے ہی پورے نہیں ہو جاتے۔ بڑے کام محنت چاہتے ہیں، ایثار چاہتے ہیں، تنظیم چاہتے ہیں، ابلاغ چاہتے ہیں، تلقین چاہتے ہیں

تعلیم چاہتے ہیں، تربیت چاہتے ہیں اور ہم خیالوں کے درمیان اشتراکِ عمل کا مطالبہ کرتے ہیں۔ تمام عوام اور ساری سیاسی پارٹیوں کو جو جمہوریت اور باہمی احترام اور رواداری کی قدروں کو عزیز رکھتی ہیں مل بیٹھنا چاہیے۔ انھیں فاشزم کے تیز رو جگرناٹ کو پوری طاقت کے ساتھ پیچھے کی طرف دھکیلنا ہے، اس سے پہلے کہ وہ ہم سب کو اور شرافت اور بھلمنساہت کی ساری روایات کو روند ڈالے۔ ہمیں احساس ہونا چاہیے کہ اس وقت سب کچھ داؤ پر لگا ہوا ہے اور پالا ایسے قمار باز حریف سے پڑا ہے جو کھیل کے قواعد اور اصولوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ مسلمانوں کے لیے صرف ایک راستہ ہے داخلی دھرماندھ کو نکال باہر کریں اور خارجی دھرماندھ کا اہلِ وطن کے ساتھ مل کر، جم کر، ڈٹ کر مقابلہ کریں۔ ہمارے رفیقِ سفر نے اسی کی طرف اشارہ کیا اور اندر کمار گجرال نے اسی کی صراحت فرمائی تھی۔

(۲۹ ستمبر ۱۹۹۲)

آزاد بنام جناح

بابری مسجد شہید ہوگئی تو سنگھ پریوار کے سورماؤں نے بغایت اطمینان اور خوشی کا اظہار کیا۔ انھوں نے، ان میں سے کسی نے اس وقت یہ نہیں کہا کہ ہم نے بالآخر شری رام چندر جی کی جنم بھومی کو زورِ بازو سے آزاد کرالیا: یہ بھی نہیں کہا کہ علاحدگی پسندی کی جس ذہنیت نے ملک کا بٹوارہ کرایا تھا اس نے ہندو رائے عامّہ کے آگے آج منہ کی کھائی! کہا تو یہ کہا کہ آج ہم نے غلامی کی نشانی کو مٹا دیا۔ اس بے تصنع ردِّ عمل سے کیا ثابت ہوتا ہے؟ دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ اس طویل دور کو جب ملک کا انتظام ہندو اور مسلمان مل کر کیا کرتے تھے لیکن تخت پر مسلمان بادشاہ بیٹھتا تھا، ہمارے ہندو بھائی غلامی کا دور سمجھنے لگے تھے، انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں انھوں نے اپنے ذہنوں سے وہ بڑا فرق مٹا دیا جو مسلمان اور انگریز حکمرانوں میں تھا مسلمان ان دوسرے حملہ آوروں کی طرح جو باہر سے آئے تھے، ہندستان میں آباد ہو گئے اور اسے اپنا وطن بنا لیا۔ خواہ سنگھ پریوار اور اس کے فلسفے سے اثر لینے والے دوسرے لوگ کچھ بھی کہیں، عالمی اور معروضی مؤرّخ خود آریاؤں کے متعلق بھی یہ رائے رکھتے ہیں کہ وہ باہر سے ہندستان میں آئے، ان میں سے بیشتر شمالی ہندستان میں بس گئے اور اس کے بس جانے کی وجہ سے ملک کا یہ حصّہ آریہ ورت کہلایا۔ انگریزوں نے ہندستان کو اپنا وطن نہیں بنایا، وہ کالے کوسوں دور سے ہندستان پر حکومت کرتے رہے — وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی شکل میں آئے تھے یہاں تجارت کرنے۔ کمپنی کا دور ہندستان کی تاریخ کا تاریک ترین دور ہے کہ اس نے تجارت کے بھیس میں قزّاقی کی اور انتہائی بے دردی کے ساتھ ہندستانیوں کو لوٹا کھسوٹا، یہاں کی صنعتوں کو جان جان کر پامال کیا تاکہ برطانیہ کی حریف مصنوعات ہندستان کے بازار پر چھا جائیں۔ بازار پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لیے ۱۸۵۷ء کی "شورش" فرو کرنے کے بعد کمپنی کو ہٹا کر ملکہ وکٹوریہ کو ہندستان کے تخت پر بٹھا دیا۔ اس سے بڑھ کر تنگ نظری اور بے بصری کیا ہو گی کہ مسلمانوں اور انگریزوں کا ذکر ایک ہی

سائنس میں کیا جائے۔

راقم سطور کو اپنے تجربہ سے یاد ہے کہ ۱۹۴۷ء میں آزادی کے موقع پر ہمارے کئی نیتاؤں نے ایک ہزار سالہ غلامی سے آزاد ہونے کا جشن منایا تھا ان شعور باختہ لوگوں کو نہ تاریخ کا ادراک تھا، نہ اپنوں اور بیگانوں میں امتیاز کرنے کا سلیقہ، وہ غلامی اور آزادی کے بیچ فرق کرنے کے اہل بھی نہ تھے۔ ۱۹۹۲-۹۳ء میں یہ بات اور شدت اور وثوق کے ساتھ دہرائی گئی۔ غلامی کو آزادی کہہ دیا گیا، آزادی کو غلامی۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

بابری مسجد کے انہدام کے جلو میں یہی بات کئی بار، کئی طرح سے کہی گئی کہنے والوں میں ہمارے ممتاز صحافی شری گری لعل جین (سابق مدیر ٹائمز آف انڈیا)، شری لعل کرشن اڈوانی (لوک سبھا میں حزب مخالف کے لیڈر) اور شری بال ٹھاکرے (شیوسینا کے سربراہ) شامل ہیں۔ الفاظ مختلف ہیں لیکن ان تینوں عمائدین نے اپنے اپنے انداز سے لفظاً یا معناً بابری مسجد کے مسمار ہونے پر خوشی اور فخر کا اظہار کیا ہے اور اس کو ملک کی تاریخ اور ہند و مسلم تعلقات کے لیے ایک بڑا سنگِ میل قرار دیا ہے اور امید ظاہر کی ہے کہ مسلمانوں کو اب اپنی اوقات اور حیثیت کا اندازہ ہو جائے گا، وہ اب ہوش کے ناخن لیں گے اور ہندوؤں کے ساتھ اور ملک کے تئیں اپنے رخ کو بدل ڈالیں گے۔ دوسرے الفاظ میں وہ تعداد کی اندھی اور بے درد منطق کو سمجھ لیں گے اور مغلوب و مفتوح کی حیثیت کو تسلیم کرنے میں اب انھیں کوئی تامل نہیں ہوگا۔ ہندو کلچر کی بالادستی ان کے دل پر نقش ہو جائے گی کہ قومی کلچر دراصل یہی ہے۔

اُس طاقت کے نشے میں جو انتہا پسند ہندوؤں کو کثرتِ تعداد کے علاوہ پولیس اور ہمہ رنگ فورسیز کی جانبداری سے حاصل ہوئی، یہ لوگ دو تین موٹی موٹی باتیں بھول گئے، ایک تو یہ کہ وہ اپنے رویہ سے مولانا ابوالکلام اور دوسرے مجاہدینِ آزادی کی روش کو غلط اور مسٹر جناح اور دوسرے تقسیم خواہوں کے مسلک کو صحیح ثابت کر رہے ہیں، دوسرے پاکستان میں مذہبی ریاست کی ناکامیابی کے باوجود یہ لوگ اسی روش کو اختیار کر رہے ہیں جس پر پاکستان کاربند ہو کر ناکامیاب ہوا اور جو کثیر المذاہب ملک کے لیے بہر حال ناموزوں ہے، تیسرے ہندو اور ہندستان میں جان و تن کا رشتہ تسلیم کر کے وہ ہندستان کی غیر مسلم آبادی پر عرصۂ حیات تنگ کر رہے ہیں اور دستورِ ہند کو روند رہے ہیں۔ چوتھے، مسلمانوں کو ڈرا دھمکا کر، ٹھوک پیٹ کر تابعِ فرمان بنانے کا منصوبہ تیار کر رہے ہیں جو عملی تعبیر سے ہمیشہ نا آشنا رہے گا۔

اقبال جیسا ژرف نگاہ اور عالم شناس شاعر ذہنِ ہندی کا ثنا خواں تھا، یہاں کے فلسفیوں، ریاضی دانوں اور ہیئت دانوں نے زندگی کے بہت سے سربستہ رازوں کو بے نقاب کیا، لیکن اس تخیّل سے باوجود رواداری کے ذہنِ ہندی محروم رہا جو اپنے کو دوسرے کی جگہ رکھ سکتا ہے، جو اس کے جذبات اور احساسات کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ چنانچہ ہندوؤں نے مسلمانوں کو سمجھنے میں پیہم غلطیاں کیں اور کرتے چلے جا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کا دھیان آج تک اس بات کی طرف نہیں گیا کہ وجہ کیا ہے کہ بڑے بڑے مسلمان رہنماؤں نے شروعات اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ اشتراکِ عمل سے کی اور آزادی کی لڑائی بڑے ذوق و شوق کے ساتھ لڑی لیکن آگے چل کر ان میں سے ہر ایک نے یہ محسوس کیا کہ اقلیت کے حقوق کو نظر انداز کیا جا رہا ہے اور وہ معرضِ خطر میں ہیں۔ یہ سلسلہ ہندستانی مسلمانوں کے سب سے بڑے اور دور اندیش لیڈر سید احمد خاں سے شروع ہوتا ہے۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور مسٹر جناح کو سرسید کی طرح مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے کانگریس سے الگ ہونا پڑا۔ یہ سلسلہ بظاہر مولانا حسرت موہانی پر ختم ہوتا ہے۔ مولانا آزاد وفاداری کو اصل ایمان سمجھ کر علاحدہ تو نہیں ہوئے، لیکن انھوں نے اپنی کتاب "انڈیا ونز فریڈم" میں دل کے پھپھولے ضرور پھوڑے اور رفقاء کے طرزِ عمل سے بددلی کا اظہار کیا۔ یہ توارُد کیسا؟ کیا یہ سب کے سب مسلم رہنما اچانک وطن دشمن بن گئے، کیا سب کو وطن دشمنوں نے خرید لیا، آخر یہ ماجرا کیا ہے؟

اس لیے یہ ضروری ہے کہ اکثریت اور سب سے بڑی اقلیت ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں، ایک دوسرے کو پہچانیں، ایک دوسرے کے جذبات احساسات، روایات اور اعتقادات کا احترام کریں۔ نہ اکثریت کو یہ سودا سر میں سمائے کہ بھارت کے سارے نواسی اسی کے رنگ میں رنگ جائیں، نہ اقلیت دِفاعًا الگ تھلگ رہے۔ دونوں سر جوڑ کر بیٹھیں، غریبی، جہالت، بیماری، بے ایمانی، فرقہ واریت اور تشدد کے خلاف معرکہ آرا ہوں اور قدم سے قدم ملا کر چلیں۔ ماضی کے صندوق کو نہ کھولیں۔ اس میں نہ جانے کیسے کیسے استخواں چھپے ہوئے ہیں۔

انتہا پسند ہندوؤں کا یہ خیال کہ مسلمانوں پر متواتر حملے کر کے انھیں پست کیا جا سکتا ہے، ان کی ریڑھ توڑی جا سکتی ہے، انھیں سرنگوں اور زمیں بوس کر سکتے ہیں، سرتاسر غلط ہے اور گواہی دے رہا ہے کہ وہ نہ صرف مسلمانوں کے مزاج سے بلکہ انسانی فطرت سے بھی ناواقف ہیں۔ اقلیت کو اگر یہ احساس دلایا گیا کہ اس پر حملے کیے جا رہے ہیں، اس کی شخصیت اور شناخت کو

مٹانے کی کوششیں ہو رہی ہیں تو اگر اس میں غیرت کی کوئی رمق بھی باقی ہے تو وہ اکثریت سے اپنے آپ کو بہت دور کر لے گی، علاحدگی کا رجحان اس میں اور شدت پکڑ لے گا اور اصول تو بڑی شے ہے، وہ فروع پر بھی کوئی مفاہمت نہیں کرے گی اور اپنے خول کے اندر گھستی چلی جائے گی۔ عداوت آمادہ اور جراحت پیشہ انتہاپسند لاکھ قومی دھارے اور قومی یک جہتی کی باتیں کیا کریں، یہ سب یا تو اس کے سر کے اوپر سے گزر جائیں گی یا اس کے جراحت خوردہ دل میں غم و غصہ کا ردّ عمل برپا کر دیں گی۔ ہر چند کہ ہندو انتہاپسند رہنما کثرت تعداد کے نشے میں خود کو عقل کل سمجھ بیٹھے ہیں وہ اس بدیہی حقیقت کو دیکھ نہیں پا رہے ہیں کہ حسن ارتباط، میل جول اور یک جہتی دلوں کو موہ لینے سے حاصل ہوتی ہے زور زبردستی سے نہیں۔ دل بزور شمشیر آج تک نہیں جیتے گئے، جو اکثریتیں اقلیتوں کا دل نہیں جیت پاتیں ان کے ہاتھوں میں صرف خانہ جنگی اور بربادی آتی ہے۔ یہ بات دیوار پر لکھی ہوئی ہے۔

مہاتما گاندھی انسان کی اجتماعی فطرت کے رمز شناس تھے۔ وہ جانتے تھے کہ دلوں میں کتنی کدورتیں، کثافتیں اور عداوتیں چھپی ہوئی ہیں۔ انگریزوں کو تشدد کے ذریعہ اگر نکالا گیا تو یہ سب کی سب بہ یک وقت سر اٹھائیں گی اور ان کی لپٹیں ہندستان کو جلا ڈالیں گی۔ مہاتما جی کے ایثار اور بصیرت اور بلیدان نے ان کثافتوں اور عداوتوں کو تقسیم کے کشت و خون کے بعد دبا تو دیا لیکن وہ انھیں مٹا نہ سکے وہ اپنے وجود کا احساس فرقہ وارانہ خوں ریزیوں سے دلاتی رہیں اور ایودھیا کانڈ کے بعد وہ بے مہار ہو گئیں، انھوں نے اعتبار اور افتخار حاصل کر لیا۔ اب تو ایک ہوڑ لگی ہوئی ہے کہ ،،غلامی کی نشانی،، کو مٹانے میں کلیدی کردار کس نے ادا کیا۔ شیو سینا بہ بانگ دہل اعلان کر رہی ہے کہ بابری مسجد کو اس نے توڑا اور بمبئی میں مسلمانوں کی بستیوں کو تہس نہس اس نے کیا اور انھیں کبھی نہ بھولنے والا سبق سکھا دیا۔ اور تو اور اجودھیا میں عبادت گاہ کو مسمار کرنے اور خدا کے گھر کو اجاڑنے میں سادھو سنتوں نے بھی، جنھیں خدا رسیدہ سمجھا جاتا ہے، کوئی کمی نہیں کی۔

مختصر یہ کہ اس وقت ملک دراصل تباہی کے دہانہ پر کھڑا ہوا ہے اس کو وہاں سے واپس لانا آسان کام نہیں ہے۔ یہ امید کہ اکثریت پہل کرے گی اور اقلیتوں کی شکایتوں، شکوک اور خوف کو دور کرے گی خام خیالی ہے۔ اکثریت کا ایک بڑا طبقہ سارے منظر کو فتح مندانہ دیکھ رہا ہے۔ اس میں روشن خیال لوگ بھی ہیں لیکن ان کی سنتا کون ہے؟ پہل اقلیتوں کو، خاص کر سب سے بڑی اقلیت کو کرنی چاہیے سربلندی سرافرازی اور نرمی کے ساتھ۔ سب سے بڑا اور سب سے دیر طلب اور دشوار کام ہو گا اپنے تئیں اکثریت کی غلط فہمیوں کو دور کرنا۔ کیونکہ ایک منظم

پروگرام کے تحت نصف صدی تک متواتر اکثریت کے افراد کو مسلمانوں کے خلاف بہکایا اور بھڑکایا گیا ہے۔ یہ کارروائی اپنے عروج کو گزشتہ پانچ برسوں میں پہنچ گئی۔ جو بیج مسلمانوں کے بدخواہوں نے بویا تھا اس کی فصل مسلمانوں نے کاٹ لی۔ انھیں چاہیے کہ ہندو عوام کو حقیقت سے باخبر کریں، بے بنیاد لیکن جڑ پکڑی ہوئی بدگمانیوں کو ان کے ذہنوں سے نکالیں، یہ کام تنظیم اور لگن چاہتا ہے اگر انھوں نے اس کام سے جی چرایا تو فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور خوش ہمسائگی کی ساری دوسری تدابیر رائگاں جائیں گی۔ آیندہ مضمون کا موضوع یہی غلط فہمیاں ہوں گی۔

(۵ دسمبر ۹۲ء)

خدارا خود کو ہلاکت میں نہ ڈالیے

بابری مسجد رام جنم بھومی کے قضیہ نے باہمی خیر اندیشی، خوش ہمسایگی اور بھلمناہت کو برباد کر دیا۔ پچھلے چھ سالوں میں نگاہیں بدل گئیں، دل بدل گئے، طور طریقے بدل گئے ہندستان کی اکثریت اور سب سے بڑی اقلیت کے درمیان ایک چوڑی کھائی کدورت نفرت اور عداوت کی کھد گئی۔ اب ملک کے سامنے درپیش ایک سوال ہے، اس کھائی کو پاٹا جائے یا اسے چوڑا ہونے دیا جائے؟ وزیر اعظم نے اپنی کمزوری کی تلافی، مسلمانوں کی اشک شوئی اور دنیا کو دکھانے کے لیے شاید بغیر کچھ سوچے سمجھے، یہ اعلان کر دیا کہ بابری مسجد از سرِ نو تعمیر کی جائے گی۔ یعنی جس جگہ پر وہ کھڑی تھی اسی جگہ وہ پھر سے بنائی جائے گی بعض مسلمان رہنماؤں نے مطالبہ کرنا شروع کر دیا کہ وعدہ وفا کیجیے اور زخم خوردہ اقلیت کے گھاؤ پر مرہم رکھیے، مسجد کو از سرِ نو تعمیر کیجیے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمان اقلیت پر اکثریت نے بہت بڑا ظلم کیا ہے۔ ان کی مسجد ڈھا دی۔ فطری طور پر غم و غصّہ کے اظہار کے لیے جو لوگ سڑکوں پر نکل آئے انھیں امن و امان کے محافظوں نے گولیوں سے بھون ڈالا۔ اور اکثریت کے انتہا پسندوں نے ان کی بستیوں پر یورش کر دی۔ ہم لوگ سوچنے لگے تھے کہ گاندھی جی کی شہادت کی طرح بابری مسجد کی شہادت بھی نفرت اور عداوت کو پسپا کر دے گی، ان کی جگہ ندامت لے لی گی اور تلافیٔ مافات کی کوششیں کی جائیں گی۔ ہُوا اس بار اس کے برعکس۔ اکثریت نے انفعال کے بجائے فاتحانہ افتخار کا طریقہ اختیار کیا اور دن بدن یہ رخ پختہ تر ہوتا جا رہا ہے۔

یہاں یہ بات تسلیم کر لینی چاہیے کہ بھاجپا اور شیوسینا کو چھوڑ کر ملک کی ساری سیاسی پارٹیوں نے بابری مسجد کے توڑے جانے کی سخت مذمت کی۔ سارے سیکولر عناصر ہندو بنیاد پرستوں اور رُوڑھی وادیوں کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ گھنگھور گھٹا میں یہ ایک نقرئی لکیر ہے۔ ایسے عناصر کی روشن خیالی اور انصاف پسندی کو اگر داد نہ گئی تو یہ کفرانِ نعمت ہوگا۔ ہمیں چاہیے کہ ہم ہندستان کی روشن خیال اور ترقی آمادہ پارٹیوں اور جماعتوں کے قریب آئیں اور ان کے ساتھ اپنے روابط کو استوار کریں۔

ہم سب کو مل کر اکثریتی بلکہ اعلاذاتی دھرباندھ کا مقابلہ کرنا ہے۔ ان کے علاوہ ہمیں کمزور طبقات اور درجِ فہرست ذاتوں اور قبیلوں سے بھی ربط وضبط بڑھانا چاہیے تاکہ اونچی ذات کے ہندوؤں کے ظلم اور استحصال کے طویل سلسلہ کا خاتمہ کیا جاسکے۔

یہ سب کچھ صحیح ہے اور ہمیں اپنے نقطۂ نظر میں اسی عنوان ترمیم کرنی ہے۔ لیکن روشن خیالوں، پسماندوں اور کمزوروں سے رشتہ جوڑتے وقت ہمارے دل میں ذرا دیر کے لیے بھی یہ خیال نہ آنا چاہیے کہ سیکولر عناصر ملک کی اکثریت کے ترجمان ہیں۔ جن لوگوں کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور جنھوں نے اپنے کان زمین سے لگا رکھے ہیں، ان کا تخمینہ ہے کہ مسجد کے انہدام سے ہندوؤں کی اکثریت مطمئن ہے، وہ سمجھتی ہے کہ بالآخر "غلامی کی نشانی مٹادی گئی"، اور اگر اس وقت یا آیندہ چھے ماہ کے اندر عام چناؤ ہو جائیں تو بھاجپا اور زیادہ تعداد میں واپس آئے گی۔ پشیمانی کا احساس جلد ہی کافور ہو گیا؛ اس وقت ہندو جارحیت اپنے نقطۂ عروج پر ہے۔

ایسی صورت میں مسلمانوں کو طے کرنا ہے کہ آیا وہ بابری مسجد کی تعمیرِ نو کا سرکار سے مطالبہ کریں۔ ایسا کرنے سے پہلے انھیں سوچ لینا چاہیے کہ اس مطالبہ کے مضمرات کیا ہیں۔ قارئین واقف ہوں گے کہ سرکار کے تغافل آمیز تساہل نے کارسیوکوں کو چھوٹ دے دی کہ مسجد کی جگہ پر چبوترہ بنا کر وہاں مورتی رکھ دیں۔ اب اسے وہ مندر کا نام دے رہے ہیں۔ اس طرح کارسیوکوں نے ریاستی سرکار کی نظرِ التفات اور مرکزی حکومت کی نگاہِ تغافل کے سایہ میں دو کام کر ڈالے ایک تو انھوں نے بابری مسجد مسمار کر دی، دوسرے ایک مبینہ مندر (چھوٹا سا شوالہ) بنا دیا۔ اب اگر مسجد وہاں بنتی ہے تو پہلے اس چبوترہ کو توڑنا اور مورتی کو ہٹانا پڑے گا۔ اگر سرکار نے ایسا کیا تو ملک بھر میں ایک زبردست ہنگامہ برپا ہوگا کہ سرکار مسلمانوں کو خوش کرنے کے لیے مندر توڑ رہی ہے۔ سارا نزلہ مسلمانوں پر گرے گا اور وہ بے دریغ تہ تیغ کیے جائیں گے اور اس "کارِ خیر" میں امن کی حفاظت کرنے والے دستے پہلے کی طرح حملہ آوروں کا ہاتھ بٹائیں گے، یا کم از کم نظر دوسری طرف کرلیں گے۔ سوچیے کیا ہم چاہتے ہیں کہ مسلمانوں پر جو ابھی اپنے مرنے والوں کا شمار کر رہے ہیں، زخموں کو گن رہے ہیں اور خود اپنے زخم چاٹ رہے ہیں، ایک دوسری قیامت گزر جائے؟ کوئی مانگ اس سے زیادہ ناعاقبت اندیشی اور خود آزاری کی نہیں ہو سکتی۔ اس دوسری قیامت سے جان و مال عزت اور آبرو کا جو نقصان ہوگا وہ تو ہوگا ہی، ہندوؤں کے دلوں میں ہماری طرف سے کدورت اور بڑھ جائے گی جو آیندہ زندگی کے ہر مرحلہ اور ترقی کے ہر منصوبہ میں ہمارے خلاف جائے گی۔ اجودھیا میں مسجد کے انہدام کو تماشائی بن کر جس طرح پولیس اور سی آر پی ایف نے دیکھا، اسے مدِ نظر رکھتے ہوئے کیا ہم امید کر سکتے ہیں کہ وہ نوخیز مندر کو مسمار کرنے پر راضی ہو جائیں گے۔ اگر مطالبہ کرنے کا مقصد محترم وزیرِ اعظم

کو ان کے گھر تک پہنچانا ہے تو اس کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے اُن کی صلاحیتیں الم نشرح ہو چکی ہیں اور گھر تک پہنچانے کی یہ ورزش ہماری تسکین کا باعث ہو یا نہ ہو، مہنگی ہمیں بہت پڑے گی۔ یاد رکھیے کہ اس ملک میں جب کبھی ہنگامہ ہوگا یا امن ٹوٹے گا تو اس کا سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کو ہی پہنچے گا۔

بابری مسجد اپنی اصل جگہ پر تو بننے سے رہی اور بالفرض محال وہاں بن گئی تو ایک قیامت کبریٰ بپا ہو جائے گی اور مسلمانوں پر عرصۂ حیات اور تنگ ہو جائے گا۔ تو کیا وہ دوسری جگہ بنے؟ اس طرح بننے سے کیا حاصل ہوگا؟ یہ تجویز تو مسلمانوں نے کئی سال ہوئے رد کر دی تھی۔ یہ سوچنا خام خیالی ہے کہ فسادات نے اُن کی ریڑھ اس حد تک توڑ دی ہے کہ اب وہ اُس بات کے لیے راضی ہو جائیں گے جسے وہ جائز نہیں سمجھتے۔ امید ہے کہ ہمارے اہل اقتدار اور ہمارے اہل وطن اس طرح کا سمجھاؤ دے کر ہمارے زخموں پر نمک پاشی نہیں کریں گے۔

بابری مسجد کو تعداد کے نشہ میں اکثریت کے انتہا پسند طبقہ نے زمیں بوس کر دیا، ریاستی حکومت نے سازش میں شرکت کی اور مرکزی حکومت نے آنکھیں بند کر لیں۔ بہر حال ایک فیصلہ ہو گیا۔ اس میں کوئی تبدیلی بھی اب نہیں ہو سکتی۔ مسلمانوں میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ مسجد کی مسماری کو روکتے اور اتنی طاقت اب بھی نہیں ہے کہ وہ چبوترہ توڑ کر اور مورتی ہٹا کر وہاں مسجد بنا لیں۔ ان پر مذہب کی رُو سے اب کوئی الزام عاید نہیں ہوتا۔ لہٰذا انھیں اب اس مسئلہ میں ہرگز دخل نہیں دینا چاہیے، نہ اس کے بارے میں کوئی مانگ سرکار سے کرنی چاہیے۔ اس وقت غیرت اور مصلحت دونوں کا تقاضا یہ ہے کہ وہ صبر و شکر کر کے بیٹھ جائیں۔ ملک جو چاہے فیصلہ کرے ان کا جہاں تک تعلق ہے بابری مسجد شہید ہو چکی۔ عدالتی کارروائی کو بھی اب کالعدم ہونا چاہیے، کیونکہ اس سے بھی تلخی بڑھے گی اور ملک کی اکثریت کے دل میں مسلمانوں کی طرف سے جو غبار بھر آگیا ہے وہ اور گھنا ہو جائے گا۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ مسلمانوں کو صبر کرنا چاہیے، وہ صبر و صلوٰۃ کے ذریعہ اللہ کی نصرت کے طلب گار رہیں گے۔ اب ہرگز نہ ان سے مواخذہ ہوگا، نہ ان کے علماء سے کہ مسجد کو تم نے مسمار کیوں ہونے دیا۔ البتہ اگر اب وہ ضد یا اصرار کرتے ہیں کہ مسجد اسی جگہ پر بنے جہاں وہ پہلے کھڑی تھی تو قرائن کہتے ہیں کہ ان سے اور ان کے رہنماؤں سے روزِ حشر باز پرس ضرور ہوگی کہ تم نے ایسا رُخ کیوں اختیار کیا جس کو اختیار کرنے کے لیے تم دین کی طرف سے پابند نہیں تھے اور جس کے اختیار کرنے سے قوی احتمال اس بات کا تھا کہ ایک بار پھر ہزاروں مسلمان مارے جائیں اور لاکھوں بے گھر ہو جائیں اور جو بچ جائیں ان پر اور ان کی اولاد پر ایک مدت تک عرصۂ حیات تنگ رہے۔ ہمیں سب کو سوچ رکھنا چاہیے کہ ایسے تباہ کن رُخ کو

اختیار کرنے کے لیے ہمارے پاس روزِ حشر جواب کیا ہوگا۔ جو لوگ عوام کی رہنمائی اور ہدایت کے لیے مکلّف ہیں کیا انھیں زیب دیتا ہے کہ مسلمانوں کو تباہی کی بھٹی میں جھونک دیں۔ اور آخر کیوں۔ بابری مسجد کی تعمیر نو ہو، مسجد اپنی جگہ پر بنے۔ اس پر اصرار کرنا دراصل ملّی خودکشی کے مترادف ہے۔ اور خودکشی حرام ہے، انفرادی خودکشی حرام ہے، اجتماعی خودکشی نہ صرف حرام ہے بلکہ سب سے بڑا جرم ہے۔ کیا ہماری آنکھیں اب بھی نہ کھلیں گی، کیا ہم مسلمانوں کو اس راستہ پر ڈال دیں گے جس میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے، تباہی ہی تباہی ہے جس میں ہلاکت کے سوا کچھ نہیں۔

جن لوگوں نے بابری مسجد کے سلسلہ میں ایکشن کمیٹیاں قائم کیں یا اس ضمن میں مسلمانوں کی نمایندگی مذاکرات اور ملاقاتوں میں کی، انھیں اپنی اخلاقی ذمہ داری کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے، عزت اور غیرت کے ساتھ کنارہ کش ہوجانا چاہیے۔ تھوڑی دیر کے لیے مان لیجیے کہ انھوں نے مسلمانوں کو گمراہ نہیں کیا، تو بھی خود تو فریب ضرور کھایا۔ رہنما کے لیے یہ دونوں صورتیں شرمناک ہیں، نازیبا ہیں، ناموزوں ہیں۔

روشن خیال ہندو جو ہمارے ہمدرد ہیں اور کچھ سیاسی پارٹیاں مسلمانوں سے کہیں گی کہ مسجد کو سابق بابری مسجد سے کچھ فاصلہ پر بن جانے کے لیے رضامندی دے دو۔ ہمیں چاہیے کہ ان کے اخلاص کا اعتراف کرتے ہوئے صاف صاف کہہ دیں کہ ہم زخم خوردہ ہیں، ہمارے زخموں کو اب نہ کریدیے، ہمیں مندر مسجد بحث میں نہ الجھائیے ہم پر بڑے مظالم ہوئے ہیں، ہم نے بہت نقصان اٹھائے ہیں۔ آپ جو چاہے کیجیے۔ چاہے مسجد بنایئے یا نہ بنایئے۔ بنایئے تو چاہے کہیں بنائیے، ہم سے کوئی سروکار نہیں۔ ہم صبر کرکے بیٹھ گئے، ہم بھر پائے، ہمیں اب نہ چھیڑیے۔ ہم نے جمہوریت بھی دیکھ لی۔ ہم نے سیکولرزم کو بھی آزمالیا، ہمیں حکومت کے انصاف اور اس کے کس بل کا بھی اندازہ ہوگیا۔

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

حمیت، غیرت اور مصلحت سب کا یہی تقاضا ہے۔ حزم و احتیاط بھی یہی کہتی ہے، دانش اور دور اندیشی بھی یہی راہ دکھاتی ہے۔ ان سطور کے پایاں میں یہ نامہ سیاہ بارگاہ رب العزت میں گڑگڑا کر دعا کرتا ہے کہ پروردگار ہمیں سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرما اور اس راہ پر قدم رکھنے سے روک دے جو لاریب ہلاکت اور تباہی کی راہ ہے۔ ہم بڑے نازک موڑ پر کھڑے ہیں۔ ہمیں روشنی عطا کر کہ ہم صحیح راستہ اختیار کرسکیں۔

(۲۳ دسمبر ۱۹۹۲)

آگے کی طرف دیکھیے

۶؍ دسمبر ۱۹۹۲ء کے بعد سے کوئی ہندستانی مسلمان چین سے نہیں سویا۔ کچھ سے رہا نہیں گیا، وہ گھر سے نکل آئے اور جان جان آفریں کے سپرد کر دی، باقی کُڑھتے رہے، کھولتے رہے، ظلم وستم کا نشانہ بننے کے بعد اگر داد رسی کی امید نہ ہو تو انسان اور کیا کر سکتا ہے؟ اور یہ ظلم وستم تو ایسا تھا جس میں اکثریت کے علاوہ حکومت کا تغافل اور اس کی جفا بھی شامل تھی لیکن مسلمانوں کا حوصلہ ٹوٹا نہیں ہے۔ بہت سے نوجوانوں کی آنکھوں میں انتقام کی آگ ہے لیکن انتقام سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، اس کی آگ جنگل کی آگ کی طرح ہوتی ہے کہ سارے جنگل کو جلا کر دم لیتی ہے پھر کچھ نہیں بچتا۔ دینِ حق کاظمین الغیظ اور عافین الناس یعنی غصہ کو ضبط کرنے والوں اور انسانوں کو معاف کر دینے والوں کو اچھی نظر سے دیکھتا ہے اور مصیبت کے اوقات میں صبر وصلوٰۃ کی تلقین کرتا ہے۔ آئندہ مسلمانوں کے ساتھ خدانخواستہ پھر اس قسم کا کوئی حادثہ ہوا تو اگر وہ ضبط کریں گے تو قرآنِ کریم کے تحت ایسا کریں گے۔ اپنے رہنماؤں سے تو وہ نالاں ہیں کہ انھوں نے سوائے نصیحت کے کیا دھرا کچھ نہیں، اور انھیں کٹوا دیا، نہ ان کی تنظیم کی طرف دھیان دیا، نہ ان کے دفاع کا انتظام کیا، نہ کبھی ان کی پسماندگی کو دور کرنے کے جتن کیے۔ انھوں نے اس قضیہ کے سایہ میں خود اپنی اہمیت بڑھائی، درِ میر و وزیر و سلطان تک رسائی حاصل کی، در اصل اربابِ اختیار نے ہی انھیں یک قلم مسلمانوں کا لیڈر بنا دیا ورنہ ان میں کون تھا جو مسلمانوں کی رہنمائی کر سکتا۔ ان میں سے کون خود غرضی سے اوپر اٹھ پایا، ملّت کا درد ان میں سے کس نے محسوس کیا، ان میں سے سوجھ بوجھ کس کے پاس تھی۔ فیصلوں اور اقدامات کے نتائج آگے چل کر کیا ہوں گے، اس کو سوچنے کی صلاحیت کس میں تھی؟ بابری مسجد کے دردناک اور بھیانک انہدام سے ہمارا نقصان ہی نقصان ہوا لیکن اس مالک یگر شر میں دو چھوٹے سے پہلو بھلائی کے بھی تھے، ایک تو یہ کہ ملک کو اور ہمیں اپنے خطرات کا پہلی بار صحیح اندازہ ہوا، دوسرے مسلمانوں کو خود غرض، بے اٹکل اور تباہ کن قیادت سے چھٹکارا مل گیا، سوئے اتفاق سے اگر چھٹکارا نہ بھی ملے تو بھی یہ قیادت اپنے اصلی قد تک تو سمٹ آئی۔

اب ہمیں اس بحث میں نہ پڑنا چاہیے کہ وہ غلطیاں کون کون سی تھیں اور کس کس کی تھیں جنھوں نے بالآخر اس شرمناک کرتوت کی شکل اختیار کرلی۔ ہمیں بغیر ذرا دیر کے لیے دل چھوٹا کیے، یا مایوسی کو ذہن میں راہ دیے حسب ذیل کام کرنے چاہییں۔

(۱) جہاں جہاں ممکن ہو ہمیں مل بیٹھ کر یہ اعلان کر دینا چاہیے کہ مسلمانوں کے ساتھ ناکردہ گناہ، بہت بڑا ظلم ہوا ہے اور وہ اپنے ہندو بھائیوں کے ایک عداوت پیشہ اور نفرت خو طبقہ کے علاوہ حکومتِ وقت کو اس اَتیاچار کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ حکومت کا پہلا اور بنیادی فرض ہے، شہریوں کی جان و مال اور ان کے دھرم کی حفاظت۔ ہماری ایک ریاستی حکومت نے اس فرض کو پاؤں تلے روند ڈالا، اور مرکزی حکومت نے اس فرض کی ادائیگی سے بکمالِ استغنا اور بہ لطائف الحیل سبکدوشی حاصل کرلی۔

(۲) یہ بات بھی واضح کر دی جائے کہ مسلمان جانتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ جس زمین پر بابری مسجد کچھ اوپر ساڑھے چار سو سال تک کھڑی رہی وہ زمین ان کی ہے اور اس ملک میں اگر انصاف کا چلن بحال ہوا تو وہ زمین ان کو مل کر رہے گی۔ لیکن ان کے نزدیک اب صحیح ردِ عمل یہی ہے کہ وہ خود اب اس مسجد کے سلسلہ میں کوئی مطالبہ نہ کریں۔ اب یہ مسئلہ انھوں نے ملک کے ضمیر کے حوالہ کر دیا ہے، یہ اس کی آزمائش ہے۔ خود مسلمان اب کوئی مطالبہ کرکے رجعت پسند اور عداوت پرست جماعتوں کو فروغ دینے اور مزید قوت پہنچانے سے احتراز کریں گے، وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ قضیہ اگر پھر گرمی پکڑ گیا تو انسانوں کی سلامتی اور ملک کی سالمیت کو زبردست نقصان پہنچے گا اور ہمارا وطنِ عزیز صدیوں پیچھے چلا جائے گا۔ جنگل کے قانون کی پیروی بھاجپا اور ہندو پریشد کو مبارک ہو۔ مسلمان کبھی ایسا نہ کرنا چاہیں گے۔ کم از کم ان میں سے وہ لوگ جو ٹھنڈا مزاج اور ہوش و گوش رکھتے ہیں۔

(۳) رمضان کا مبارک مہینا سر پر آگیا ہے اور عید آنے والی ہے، رمضان بھر ہمیں اپنے شہیدوں کی مغفرت کی اور مسلمانوں اور ہندستان کی سلامتی کی دعائیں مانگنی چاہییں، عید کو ہم صرف اس حد تک منائیں جس حد تک مذہب ہمیں تاکید کرتا ہے یعنی فطرہ ادا کریں اور عید کی نماز پڑھیں، کوئی جشن اس روز نہ منائیں، نہ خوشی کا اظہار کریں، یہ بڑی بے حسی اور بے غیرتی ہوگی اگر ہم نے اس بار عید کو تیوہار کے طور پر منایا۔ عید الفطر کے علاوہ عید الاضحی پر بھی ہماری روش یہی رہنی چاہیے تاکہ ہمارے اہلِ وطن کو معلوم تو ہو کہ خدا کے گھر کو مسمار کیے جانے اور اس کے بعد بے شمار مسلمانوں کے شہید اور ہزاروں گھروں کے برباد ہونے کا گھاؤ آسانی سے بھر نہیں پائے گا۔ ان دونوں تیوہاروں کے موقع پر اوسطاً ہم جتنا روپیا صرف کرتے ہیں وہ امداد یا ریلیف اور بازآبادکاری کے لیے صرف کیا جائے۔ بلکہ اس خرچہ کی رقم سے آگے بڑھ کر ہم آفت زدوں کی امداد کے لیے وسائل فراہم کریں۔ اس طرح دو کام ہو جائیں گے۔ (۱) ہم باوقار اور بے خطر طریقہ سے احتجاج کر پائیں گے۔ (۲) تنظیم اور ترتیب کے ساتھ آفت رسیدوں کی مدد

ہو سکے گی۔

(۴) چونکہ فرقہ وارانہ فسادات ہندستانی مسلمانوں کے مقدر میں لکھ دیے گئے ہیں اس لیے انھیں چاہیے کہ ان سے نبٹنے کا منصوبہ بنائیں۔ اس کے اہم اجزا یہ ہوں کہ تناؤ یا تعلقات میں ناشگفتگی کی پہلی آہٹ پر شہر کے باعزت مسلمان، وہاں کے باعزت ہندوؤں کے ساتھ بیٹھیں اور سر جوڑ کر اور قدم اٹھا کر تناؤ اور کھنچاؤ کو دور کریں اور اپنے اپنے ہم مذہبوں کو سمجھائیں اور اتحاد کی برکت اور پھوٹ کے خطرات سے آگاہ کریں، اور مقامی انتظامیہ کو بھی ہوا کے رخ سے مطلع کر دیں اور اس سے تقاضا کریں کہ تناؤ کو ٹکراؤ بننے سے روکے۔

(۵) اپنے محلوں اور گھروں میں "پہلے دفاع" کے (یعنی جب تک کہ پولیس آتی ہے) انتظام ضرور کرلیں۔ حفاظتِ خود اختیاری ہر شہری کا نہ صرف حق بلکہ فرض ہے۔ اس ضمن میں بھی مقامی اربابِ انتظام سے رابطہ کارآمد ہوگا۔ ہر شہر میں ایسے لوگوں کی موجودگی مفید ہوگی جن کی پہنچ سینیر افسروں تک ہو۔ اس پہنچ کے لیے اہتمام کرنا ہوگا۔ دور رہیں گے تو نقصان صرف ہمارا ہوگا۔

(۶) ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ بالقصد اکثریت کے ساتھ اپنے تعلقات کو خوشگوار بنائیں کیونکہ حکومت کی زمام دراصل اس کے ہاتھ میں ہے۔ اکثریت کے اہلکار نہ چاہیں تو حکومت کی ساری پالیسیاں دھری کی دھری رہ جائیں، ان پر عمل نام کو نہ ہو جیسا کہ اپنے موافق احکام کے سلسلہ میں ہمیں تجربہ ہوتا چلا آیا ہے۔

(۷) دوسری اقلیتوں اور کمزور طبقوں کے ساتھ ہمارا برتاؤ اور تعلقات ایسے ہونے چاہییں کہ ان کا گوشۂ خاطر ہماری طرف رہے۔

(۸) ہندستان کے روشن خیال افراد اور ترقی پسند جماعتوں نے مسجد کو گرانے پر سخت سرزنش کی ہے۔ وہ سوچتی ہیں کہ مذکورہ تنازعہ دراصل ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین جھگڑا نہیں ہے بلکہ یہ جدال ہے سیکولر اور کٹر پنتھی طاقتوں کے درمیان۔ ان جماعتوں اور افراد اور پریس کو ہمیں انصاف پسندی، حسنِ ارتباط اور حکمتِ عملی سے اپنے قریب رکھنا چاہیے۔

یہاں تک جو سجھاؤ تھے وہ فوری حیثیت رکھتے تھے ہمیں دور رس قدم بھی اٹھانے چاہییں۔

(۹) ہماری کمزوری، بے بسی، گمراہی اور اشتعال آمادگی اَن پڑھ ہونے کی وجہ سے ہے۔ ہمیں سب سے پہلی ترجیح رفع جہالت اور مہم خواندگی کو دینی چاہیے۔ ہماری بے توجہی نے ملک کی شرح خواندگی کو نیچا کر رکھا ہے اور اس کی ترقی کی راہ میں کانٹے بچھائے ہیں۔ ہم ایسا منصوبہ کیوں نہ بنائیں کہ دس سال کے اندر مسلمان ناخواندگی سے نجات پا جائیں گے۔ اس کے لیے محبت اور ایثار بڑی مقدار میں درکار

ہوں گے۔ لیکن زندہ رہنا ہے اور غیرت کے ساتھ تو یہ کرنا ہوگا۔

(۱۰) بچّوں کو تعلیم اس طرح سے دی جائے کہ ان کا نقطۂ نظر وطن دوستی، انسانیت نوازی، روشن خیالی اور بھلمنساہت کا رہے اور وہ آگے بڑھ کر اپنے ملک کے لیے سرمایۂ افتخار بن سکیں۔

(۱۱) بعض جانبدار مورخوں نے تاریخ کے اوراق کو سیاہ کیا ہے۔ اس کی باقاعدہ طور پر مورخین ہی کی طرف سے تردید کی جائے گی۔ تاکہ ننھے دماغوں سے باہمی بدگمانیاں دور ہوں۔

(۱۲) اردو زبان کے ساتھ جیسا برتاؤ اس ملک میں کیا گیا ہے اس کی مثال کسی دوسرے جمہوری ملک میں نہیں ملے گی۔ ایسے وقت میں جب ملک کا ضمیر مسلمانوں کی طرف سے بیدار ہوا ہے اردو کا مقدمہ اس کے اجلاس میں پیش کر کے دادرسی حاصل کرنی چاہیے، قومی پریس کو بہرحال اپنی طرف رکھنا ہے۔

یہ بات سب کو معلوم ہے کہ مسلمان سب قوموں سے زیادہ روزگار کو ترستے رہتے ہیں۔ جہاں انھیں آبادی کے تناسب کے لحاظ سے سو سرکاری ملازمتیں ملنے چاہیے تھیں وہاں انھیں صرف سولہ ملتی ہیں۔ آبادی میں ان کا تناسب ۱۲ فی صد ہے اور ملازمتوں میں تقریباً دو فی صد۔ اپنی صنعت اور تجارت کو چلانے کے لیے بھی انھیں طرح طرح کی دشواریاں ہوتی ہیں۔ ہم فریاد کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو نوکریاں نہیں ملتیں۔ جواب ملتا ہے مقابلہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ مقابلہ میں بیٹھو، صلاحیت ثابت کرو، نوکری حاصل کرو۔

سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں۔

جواب دینے والے کتنے بے حس اور بے تخیّل اور بے درد ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ نابرابروں میں مقابلہ کرا دینا ان میں سے کمزور فریق کے ساتھ بڑی ناانصافی بڑا ظلم ہے۔

ہمیں سرکار کو بتانا چاہیے کہ امن کی عمارت صرف انصاف کی بنیاد پر کھڑی رہ سکتی ہے۔ ملازمتوں میں ناانصافی سے روزگار تو ہاتھ سے جاتا ہی ہے، حوصلہ بھی ٹوٹتا ہے اور بعد میں ہمارے ساتھ انصاف کے امکانات بھی کم ہو جاتے ہیں۔

اس لیے ضروری ہے کہ ایک معیّنہ مدّت (فرض کیجیے ۲۰ سال) تک مسلمانوں کے لیے ملازمتوں میں تحفظ یا ریزرویشن ہونا چاہیے، تاکہ وہ ترقی یافتہ اکثریت اور دوسرے فرقوں کے برابر آجائیں اور بعد ازاں اپنے قوّت بازو سے ملازمتیں اور روزگار کھلا مقابلہ کر کے حاصل کریں۔

(۱۳) مسلمانوں کے متعلق ان کے وطنی بھائیوں کے دلوں میں طرح طرح کی بدگمانیاں اور غلط تصورات پھیلے ہوئے ہیں۔ انھیں دور کرنے کے لیے اوّل تو مسلمان بچّوں کو اپنے ذہن اور اسلام کی تاریخ سے معقول واقفیت بہم پہنچانی چاہیے۔ تاکہ وہ اپنے

ساتھیوں کے سامنے اسلام کی صحیح تصویر کھینچ سکیں۔ اس کا اہتمام خود مسلمانوں کو اپنے گھروں یا اپنے اسکولوں میں کرنا ہوگا۔

اس سے بھی زیادہ اہم بات اسلام کی شبیہ کو ٹھیک سے پیش کرنے کے لیے یہ ہوگی کہ ہمارے بچوں کو شروع سے یہ سمجھایا جائے کہ اسلام صرف عقیدہ اور عبادت کا نام نہیں ہے، یہ دونوں تو ذریعہ ہیں شخصیت کو بنانے اور کردار کو ڈھالنے کا۔ اگر ان کے اطوار و کردار سے راستی، رحم، پاک بازی، بھلمنساہت اور خیر اندیشی ظاہر نہیں ہوتی تو وہ مسلمان نام کے ہیں

دراصل اسلام کے نام پر ایک تہمت ہیں۔ اسلام سہل بھی ہے اور سخت گیر بھی۔ یہ اپنے ماننے والوں کو، بشرطیکہ انھیں صحیح تعلیم دی جائے، خیر و فلاح کے سانچے میں ڈھال سکتا ہے، اور خیر کا یہ دیرینہ چلن ہے کہ وہ صاحبِ خیر تک محدود نہیں رہتی۔ اپنے قرب و جوار پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اپنے جسمانی اور ذہنی دفاع کی ہمیں ضرور تیاریاں کرنی چاہییں، لیکن یہ احتیاط رکھیے کہ ہمارا نقطۂ نظر اور زندگی اور حوادث و افکار کے تئیں ہمارا رخ دفاعی اور منفی ہوکر نہ جائے بلکہ اقدامی اور مثبت اور آگے بڑھانے والا ہو۔

(۱۵) سیاست میں جو برائیاں گھس آئی ہیں ان کا خمیازہ بھارت بھگت رہا ہے لیکن کسی چیز کو صرف اس بنا پر ترک نہیں کر سکتے کہ اس میں خرابیاں داخل ہوگئی ہیں۔ ہمیں سیاسی پتّوں کو بہ یک وقت دیانت داری اور ہوشیاری سے کھیلنے کا ہنر سیکھنا چاہیے ہمیں ایسے امیدواروں کے چننے جانے میں معاون ہونا پڑے گا جو سیکولر ذہن اور فراخ دل رکھتے ہوں اور جو دوسرے ملکی مسائل کے علاوہ مسلمانوں کی ترجمانی جرأت کے ساتھ اور تعمیری اور موثر انداز میں کر سکیں۔ خود غرض نمایندوں سے اوّلین فرصت میں نجات پانے میں ہی ہمارے لیے عافیت ہے۔ اگر ہم نے آئندہ انتخابات سے پہلے ایک بیدار رائے عامّہ نہ بنائی اور نسبتاً اچھے اور لائق امیدواروں کو نہ چُنا تو ہم وہیں کے وہیں رہ جائیں گے اور ہماری بات کوئی نہیں سنے گا۔ یہاں بیداری کے علاوہ تنظیم درکار ہوگی۔ سیاست میں جاگیرداری کا خاتمہ ریاستوں میں زمینداری کے خاتمے سے کم اہم نہیں ہے۔ نمائندوں کا کام تبادلے یا دوسرے چھوٹے بڑے نجی کام کرا دینا نہیں ہے۔ ان کا اصلی کام یہ ہے کہ حکومت کو صحیح مشورہ اور اپنے رائے دہندوں اور ان کے احساسات کے بارے میں صحیح اطلاعات دیں اور جرأت کے ساتھ ان کے حقوق کا مطالبہ کریں۔ یہ عہد تو ہمیں اپنے امیدواروں سے لینا پڑے گا کہ وہ مسلمانوں کی تعلیمی و اقتصادی پیش رفت اور ان کی سلامتی کے لیے باخبر اور با اثر آواز اٹھائیں گے۔ جہاں تک سلامتی کی بات ہے کچھ عرصے سے یہ رجحان زور پکڑ رہا ہے کہ پولیس اور دوسری حفاظتی فورسیز فسادات کے موقع پر مسلمانوں کے خلاف تعصب برتنے لگتی ہے۔ بھاجپا، شیو سینا اور سنگھ پریوار کی دوسری شاخوں کے اثر سے

اور ایودھیائی نزاع کے سائے میں یہ خطرناک رجحان بہت بڑھ گیا ہے۔ اس کے خلاف مرکزی سرکار نمائش کی خاطر شاید کچھ آوازیں اٹھائے؟ لیکن ان فورسیز کے ساتھ اپنے رخ اور اپنے تعلقات کو استوار خود ہمیں کرنا ہوگا۔ زندگی میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ کسی کو بُرا سمجھتے رہیئے وہ برا بن جاتا ہے، کسی سے مخالفت یا عداوت محمول سمجھیے تو وہ واقعی مخالفت اور دشمنی اختیار کر لیتا ہے یا ان کی لے کو تیز تر کر دیتا ہے۔ ہمیں اس مسئلے پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ یہ بھی آپ نے دیکھا ہوگا کہ طاقت آہستہ آہستہ اراکینِ حکومت کے ہاتھ سے نکل کر پولیس کے ہاتھ میں جا رہی ہے۔ حالات معمول سے ہٹ جائیں تو یہ طاقت بہت بڑھ جاتی ہے، پولیس سے بَیر، اور پولیس سے دشمنی دونوں پُر خطر ہو گئی ہیں اور یوں تو ہمیں دانش اور بزم استدلال کے ساتھ اپنے وطن کے اکثریتی فرقہ کو متواتر کوشش کے ذریعے اپنے تئیں خوش گمان بنانا ہے۔ ان کے آگے جھکنا تو ہرگز نہیں لیکن ان سے دوستی اور خوش ہمسائیگی کا ہاتھ ملانا ہے۔

(۳۰، دسمبر ۹۲ء)

عزتِ نفس، توازن، تنظیم

اس وقت جو کچھ ہم پر گزر رہی ہے وہ قیامت سے کم نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم نے اپنے کان بند کر لیے ہیں اور صور کی آواز ہم تک نہیں پہنچ رہی ہے، ہم نے آنکھیں بند کر لی ہیں اور ہم نہیں دیکھ پا رہے ہے کہ جو کچھ اس وقت بمبئی میں ہو رہا ہے وہ ایک بھیانک ریہرسل ہے اس ہولناک ناٹک کا جو پورے ملک کو اپنی آغوش میں لینے والا ہے۔ یہ خانہ جنگی سارے ہندستان کو تہس نہس کر سکتی ہے، ہمارا وطن عزیز راکھ کا ڈھیر بن سکتا ہے۔ عین اس وقت جب یہ قیامت برپا ہے آل انڈیا بابری مسجد ایکشن کمیٹی راجدھانی میں بیٹھ کر یہ فیصلہ کرتی ہے کہ مسلمان یوم جمہوریت کا بائیکاٹ کریں۔ یہ حضرات اتنی موٹی سی بات بھی نہیں سمجھ پا رہے ہیں کہ جمہوری دستور ہی ہندستان میں ہمارے وجود کا جواز ہے، یہی ملک کا ضمیر ہے، اسی کی طرف ہمارا روئے سخن ہے۔ اپیل ہم اسی سے کر سکتے ہیں دہائی ہم اسی کو دے سکتے ہیں، یہی وہ شیرازہ ہے جو ہمیں اپنے اہل وطن کے ساتھ باندھے ہوئے ہے۔ ہم اگر یوم جمہوریت کی تحقیر کریں گے اور آئین کو صلواتیں سنائیں گے تو جو کچھ رہی سہی ہمدردی ہمارے لیے ہندستان میں نظر آ رہی ہے وہ صبح کے کہرے کی طرح چھٹ جائے گی۔ اسے بغاوت اور بے وفائی پر محمول کیا جائے گا۔ عقل مند وہ لوگ ہیں جو دوسروں کی غلطیوں کو دیکھ کر ان غلطیوں سے خود کو بچاتے ہیں، بے شعور وہ لوگ ہیں جو اپنی ہی غلطیوں کو دہراتے ہیں۔

مسلمانوں کے خلاف جذبات کو مسموم کرنے اور فضا کو بگاڑنے کی شروعات اسی قسم کے اعلان سے ہوتی تھی۔ جن صاحب نے بغیر سوچے سمجھے برہم ہو کر یہ اعلان کر دیا تھا ان میں اتنا دم بھی نہ تھا کہ اس اعلان پر جمے رہتے۔ آخری لمحہ میں انھوں نے اعلان واپس لے لیا اور اہل وطن کو بتا دیا کہ یہ گیدڑ بھبکی ہے مسلمانوں میں تنظیم نام کی کوئی شے ہے ہی نہیں کہ وہ کوئی ملک گیر تحریک چلا سکیں اور اپنی بات کا (بات صحیح ہے یا غلط، اس سے قطع نظر) بھرم رکھ سکیں۔ حیرت اور

جگر گداز افسوس اس بات پر ہے کہ قیادت کی بے شعوری کے جلو میں اتنی بڑی ملک گیر بربادی دیکھنے کے بعد پھر اسی طرز عمل کی دعوت مسلمانوں کو دی جارہی ہے۔

اسی روزنامہ کے کالموں میں یہ تجویز رکھی گئی تھی کہ مسلمان عید الفطر اور عید الاضحی کے موقع پر کوئی خوشیاں نہ منائیں کہ ان کے دل زخمی ہیں، ایسی حالت میں جشن منانا دنیا کو اپنی بے حسی اور بے دردی کا ثبوت فراہم کرنا ہے اور اخوت اور انسانی ہمدردی دونوں کو پیٹھ دکھانا ہے۔ امسال ان دونوں بڑے تیوہاروں کو صرف اسی حد تک منانا چاہیے جس حد تک یہ مذہب کی رُو سے واجب ہے اور جو روپیا ان تیوہاروں کو بصورتِ جشن منانے میں صرف ہوتا وہ فساد زدوں کی راحت رسانی میں صَرف کیا جائے۔ اس طرح ہمارے کبھی نہ مٹنے والے غم اور شہیدوں اور زخمیوں اور برباد شدہ اور روزگار رسیدہ بھائیوں کے تئیں ہماری ہمدردی کا مؤثر اور کارآمد اظہار بھی ہو جائے گا اور ابنائے وطن کو ہمارا احتجاج ناگوار بھی نہ ہوگا۔ یہاں یہ حال ہے کہ ری پبلک ڈے منایا جاتا ہے یا نہیں منایا جاتا اس کی آنکھوں آنکھ اور کانوں کان کسی کو خبر نہیں ہوتی۔ ایسا احتجاج کس کام کا جو ایک طرف آئین کے اعتبار سے قابلِ اعتراض ہے، دوسری طرف ناقابلِ اظہار ہے۔ بہرکیف یہ مسلمانوں کی صوابدید پر منحصر ہے کہ وہ ایک لایعنی اعلان پر لبیک کہہ کر ملک کی فضا کو اپنے لیے اور زیادہ ناموافق بنا دیں یا وہ اپنے دو بڑے تیوہاروں کو اس انداز سے منائیں جیسے وہ انسان مناتا ہے جس کے گھر میں موت ہو گئی ہو۔ ایسے میں بچے بھی نئے کپڑوں اور کھلونوں کی فرمائش نہیں کرتے۔ انھیں بھی احساس ہونا چاہیے کہ ہم پر کتنی بڑی مصیبت پڑی ہے۔ انھیں ابھی سے یہ محسوس ہونا چاہیے کہ غم اور خوشی دونوں ناقابلِ تقسیم ہیں۔ ہزاروں لاکھوں گھروں میں کہرام مچا ہو، اور ہم بے غیرتی کے ساتھ عیدیں پر جشن منائیں، یہ بات نہایت ناروا ہے۔ ہندستان کا اس وقت جو نقشا ہے اور مستقبل کے جو آثار ہیں ان کے لحاظ سے ہمیں اپنے بچّوں کو ابھی سے مصیبت زدوں کے ساتھ عملی ہمدردی کا عادی بنا دینا چاہیے، بغیر کسی کو الزام دیے یا بُرا کہے۔

اس وقت ہماری شعور باختہ قیادت کو چھوڑ کر پڑھے لکھے مسلمان عام طور پر صبر اور ضبط کا مشورہ دے رہے ہیں۔ یہ مشورہ ہمیں قبول کرنا چاہیے اور اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ لیکن یہاں راقم سطور یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہے کہ صبر اور ضبط کے معنی کندھا یا ہتھیار ڈالنے کے نہیں ہیں۔ ہمیں نہ کسی سے دبنا ہے نہ کسی کے آگے جھکنا ہے، سوائے اپنے پروردگار کے۔ یاد رکھیے کہ ہمارا سب سے قیمتی سرمایہ عزتِ نفس ہے۔ شخصیت کی تعمیر خواہ وہ انفرادی شخصیت ہو، خواہ ملی شخصیت ہو، غیرت، عزّتِ نفس اور سرافرازی سے ہوتی ہے۔ وہ آدمی

ہی کیا اور وہ جماعت ہی کیا جو بادِ مخالف کے آگے جھک جائے۔ حوادث جس کی ریڑھ کو توڑ دیں، جس کے سر کو جھکا دیں۔ کسرِ نفسی کے معنی زنہار کسرِ شخصی یا غیرت شکنی نہیں ہیں۔ تواضع اور انکسار میں اگر غیرت اور خود اعتمادی کا استر نہ لگا ہوا ہو تو وہ ٹکرہ گدائی سے بدتر ہے۔ شیخ شیراز کہہ چکا ہے۔

تواضع زگردن فرازاں نکوست
گدا گر تواضع کند خوئے اوست

(عاجزی اور انکسار ان لوگوں کو زیب دیتا ہے جو سرافراز ہوں۔ اگر کوئی بھکاری عاجزی اور انکساری برتتا ہے تو اس میں خوبی کی کون سی بات ہے، یہ تو اس کی عادت ہی ہے، اسی عادت پر وہ پلا بڑھا ہے، پروان چڑھا ہے، اس کا سر تو ہر آستانہ پر جھک ہی جاتا ہے)

اکڑ، گھمنڈ، ہیکڑی اور دل آزاری سے بچیے لیکن یہ تاثر خدارا کسی کو نہ دیجیے کہ انتہاپسندوں کی درندہ صفت شقاوت اور پولیس کی گولیوں نے مسلمانوں کی کمر توڑ دی ہے اور وہ انفعال کی قبا پہن کر اور ہاتھ باندھ کر برادرانِ وطن کے دربار میں حاضر ہوئے ہیں۔ ایسا کرنے سے فنا ہو جانا بہتر ہے۔ انسان ایک گوہرِ ہر یکدانہ ہے عزّت نفس اس کی آب ہے۔ آب جاتی رہی تو گوہر میں کیا بچا؟

راستہ دراصل اعتدال کا راستہ ہے۔ نہ گھمنڈ کیجیے نہ زمین میں گڑتے جائیے، دوستی اور مصلحت اور مصالحت کا ہاتھ بڑھائیے، اعتماد اور برابری کے ساتھ۔ تعداد کی کمی پورا کرنے کا صرف ایک طریقہ ہے، قد کو اونچا کیجیے محنت کیجیے، فضیلت حاصل کیجیے۔ دیکھنے والوں کی آنکھوں کو خیرہ کیجیے۔ اگر زندہ رہنا ہے تو بالآخر یہی کرنا ہوگا۔ شروع ابھی سے کیوں نہ کر دیجیے۔ نامساعد حالات سے ہمت اخذ کیجیے۔ یہ آپ کی صوابدید پر ہے کہ موجودہ مشکلات کو زنجیر بنایئے یا ان سے مہمیز کا کام لیجیے۔ ہم سے یہ سوال کرنے کا حق کسی کو نہیں ہے کہ آیا ہم وطن کے تئیں وفادار ہیں۔ ہماری وفاداری اظہر من الشمس ہے۔ لیکن ہمیں خود سے یہ پوچھنے کا حق ضرور ہے کہ ہم نے وطن کی فلاح اور ترقی میں کیا حصّہ لیا ہے، کیا وہ حصّہ ہمارے شایانِ شان ہے، کیا ہم ان مواقع کا، وہ لاکھ محدود سہی، پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں جو ہمیں دستیاب ہیں؟ کیا ہم نے ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی جو ہمارے بارے میں ہر چہار سو پھیلائی گئی ہیں۔ کیا مفاہمت یا باہمی خیراندیشی کی سمت ہم نے کوئی قدم اٹھائے ہیں؟

یہ سوالات مسائل کو عنوان کے تیسرے ٹکڑے کی طرف لا رہے ہیں۔ کسی جماعت کی ترقی، فلاح بلکہ بقا کے لیے تنظیم بہت ضروری ہے۔ تنظیم کے بغیر کوئی

اجتماعی مقصد پورا نہیں ہوتا، نہ کوئی مہم سر ہو پاتی ہے۔ ہم لوگ تفرقہ، خانہ جنگی، غیبت اور حسد کے خوگر ہو گئے ہیں۔ سدا کے لیے نہ سہی، تھوڑی دیر کے لیے ہی جب تک کہ یہ بحران ختم نہیں ہوتا، ہمیں ان بری عادتوں کو بھول جانا چاہیے۔ تنظیم کی بدولت ہم تعلیمی، اقتصادی، سماجی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے قدم اٹھا سکتے ہیں۔ تنظیم کے سایہ میں ہم حکومت اور اہل وطن سے مسائل پر اعتماد اور توانائی کے ساتھ گفتگو کر سکتے ہیں۔ تنظیم کے ہی زیر اثر ہم نازک حالات میں دفاع اور راحت رسانی کے ڈول ڈال سکتے ہیں۔ تنظیم کی روشنی میں ہم مستقبل کے لیے منصوبے بنا سکتے ہیں اور کمزور طبقات کے ساتھ مل کر انھیں اور خود کو طاقت پہنچا سکتے ہیں۔ ہمیں سیکولر جماعتوں کی ہمدردی کی لہروں میں نہیں بہنا ہے۔ بات اسی شخص یا گروہ کی موثر اور مضبوط ہوتی ہے جو طاقت کے ساتھ اور انصاف کے ساتھ گفتگو کرتا ہے۔ ورنہ اس کی بات پوشیدہ حقارت کے ساتھ ٹال دی جاتی ہے۔ طاقت صرف دست و بازو کی طاقت کو نہیں کہتے۔ طاقت صرف رائفل کے دہانہ سے بھی حاصل نہیں ہوتی۔ طاقت فراہم ہوتی ہے، اخذ ہوتی ہے، علم سے، اتحاد سے، تنظیم سے، محنت سے، ٹکنولوجی سے۔ وہ قومیں، وہ جماعتیں جو کمزوری، انتشار اور بے عملی پر قناعت کر بیٹھتی ہیں، راہئ ملک عدم ہو جاتی ہیں۔ بیٹھیے، ضرور بیٹھیے اہل وطن کے ساتھ افہام و تفہیم کے واسطے۔ لیکن یاد رکھیے کہ وہ آپ کی بات کا احترام بقدر آپ کی طاقت کے کریں گے۔ وہ طاقت جو اپنی حفاظت کر سکے لیکن جو دوسروں کو جراحت پہنچانے کے لیے تیار نہ ہو۔ فراخ مشرب اور روشن خیال جماعتوں کے رحم و کرم پر زندہ رہنا کوئی جینے میں جینا ہے۔ ان سے رابطہ استوار کیجیے، ضرور کیجیے۔ لیکن ان کی ہمدردی اور تائید پر غرّہ نہ ہوجیے۔ اعتماد پروردگار کی صیانت اور اپنی طاقت پر کیجیے۔ آلیور کرامویل نے اپنے لشکر کو ہدایت کی تھی کہ اللہ پر بھروسا کرو اور بارود کو خشک رکھو۔ آپ کا بارود کیا ہے۔ تنظیم، تعلیم اور اپنی حفاظت کا سروسامان۔ بارود سیل گیا تو سارے اسلحے، سارے وسایل، ساری ہمدردیاں بے کار ہو جاتی ہیں۔ وطنِ عزیز آپ سے مطالبہ کرتا ہے کہ قوت حاصل کیجیے کہ آپ کی قوت سے وہ بھی قوی ہوگا۔ وہ آپ سے اصرار کرتا ہے کہ اعتدال اور توازن کا راستہ اختیار کیجیے کہ عافیت سلامتی اور ترقی اسی میں ہے۔ نہ پُرصدا جوش و خروش کی افراط میں پڑیے، نہ خودشکنی و خودسپردگی اور گداگری کی تفریط میں۔ ہمتِ مرداں، مددِ خدا کے مترادف ہے، مددِ خدا حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔

(۱۲ جنوری ۱۹۹۳ء)

طاقت کی منطق

راقم حروف شروع سے فریاد کرتا رہا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے مقدور بھر اپنے اہل وطن خصوصاً ہندوؤں کے ساتھ اپنے تعلقات خوشگوار اور استوار رکھنے چاہییں۔ ان پر واجب ہے کہ اپنے اہل وطن کے احساسات کا ہر قدم پر خیال رکھیں اور ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے رہیں۔ وہ اپنی اس بات پر ابھی تک قائم ہے، اگرچہ مسلمانوں پر اس اثنا میں ایسے ایسے مظالم توڑے گئے جو کسی مہذب اور بھلے آدمی کے تصور میں بھی نہیں آسکتے تھے۔ اس زہر کا جو بھاجپا کے اشارہ پر سادھوی رتھمبرا اور سادھوی اوما بھارتی اور اس قبیل کے دوسرے مقررین نے اپنی ہذیانی تقریروں کے ذریعہ ہندستان بھر میں پھیلا دیا، تریاک صرف یہی ہے کہ ہم ان غلط فہمیوں کو جو ہماری طرف سے ہمارے ہندو بھائیوں کے دلوں میں بٹھا دی گئی ہیں دور کرنے کی ہر ممکن کوشش لگاتار کرتے رہیں۔ ان کے ساتھ وقتاً فوقتاً مل کر بیٹھیں اور مشترک مسائل کو اتفاق رائے سے حل کریں۔ یہ تو ہوئی مصلحت اور خیر اندیشی کی بات۔

لیکن ہمیں ایک پل کے لیے یہ نہ بھولنا چاہیے کہ بات اس کی سنی جاتی ہے، محفلوں میں راہ بھی اسی کو ملتی ہے جس کے پاس طاقت ہو۔ "مرے پر سو دُرّے" یہ کوئی فرسودہ کہاوت نہیں ہے، یہ آئینہ ہے انسانوں کی نفسیات اور ان کے طرزِ عمل کا۔ جو کوئی بھی فریاد کرے گا، سوال کے لیے ہاتھ پھیلائے گا، شکایت لے کر کسی صاحب اختیار کے پاس جائے گا، اس کو یا تو جھڑک کر بھگا دیا جائے گا یا اس پر حقارت کے تازیانے برسائے جائیں گے۔ اور اگر وہ ان دونوں سے بچ گیا تو اُسے کل پر ٹال دیا جائے گا، اس کل پر جس کی صبح کبھی طلوع نہیں ہوتی۔ آواز میں وزن، فریاد میں طاقت، شکایت میں اثر جب ہی پیدا ہوتا ہے جب انصاف چاہنے والا ضعیف، خاکسار اور نیاز مند نہ ہو، جب اس کی بات رد کرنے یا ٹالنے سے پہلے مخاطب یا مسئول یہ سوچنے پر مجبور نہ ہو جائے کہ یہ فیصلہ مہنگا پڑے گا کیوں کہ سائل کی حیثیت ایسی ہے کہ اس سے بھی کبھی کام پڑ سکتا ہے، اپنے وقت پر بے مہری اور تغافل سے پیش آنے کی سکت اس میں بھی ہے۔ جو

شخص دوستی کا ہاتھ بڑھائے اسے یہ اعتماد ہونا چاہیے کہ دوسرا فریق اگر اچانک اس کے ہاتھ کو موڑنا چاہے تو وہ پنجہ کشی کرسکتا ہو، اور اپنے ہاتھ کو جراحت سے بچا سکتا ہو۔ جس کے ہاتھ میں اتنی طاقت نہ ہو وہ صرف دونوں ہاتھ باندھ کر یا جوڑ کر کھڑا ہوسکتا ہے۔ ہاتھ ملا نہیں سکتا۔ انسانی فطرت کا وہ نباض جو شیخ سعدی کے نام سے معروف ہے کہ گیا ہے کہ انسان کے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونے سے بہتر یہ ہے کہ آدمی کھولتے ہوئے چونے میں ہاتھ ڈال دے۔ یہ بات انفرادی طور پر صحیح ہے اور اجتماعی طور پر اس کی صحت اور زیادہ مسلّم ہے۔ انسانوں کی کوئی جماعت، کوئی گروہ، کسی دوسرے کے ساتھ بالعموم فی سبیل اللہ نہ ہمدردی کرتا ہے نہ احسان، نہ انصاف۔ جماعتیں دوسری جماعتوں کے ساتھ ایسا برتاؤ عام طور پر جبھی کرتی ہیں جب وہ اپنی مصلحت سے ایسا کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ مصالحت کی قبا میں جب تک طاقت کا استر نہ لگا ہو وہ تار تار ہو کر رہتی ہے اور اس کا پہننے والا سر بازار ننگا ہو جاتا ہے۔ یہ قدرت کا قانون ہے، جو لوگ اس قانون کو نظر انداز کریں گے نقصان اٹھائیں گے۔ دست و بازو میں طاقت پیدا کیجیے اور عنان کو مصالحت کی طرف موڑیے۔

گھر انسان کا قلعہ ہوتا ہے۔ قلعہ میں غنیم داخل ہو جائے تو تباہی آجاتی ہے اس قلعہ کو مضبوط بنائیے، ہمسایوں سے رابطہ کو استوار کیجیے اور "پہلے دفاع" یا فرسٹ ڈیفنس کا پورا اہتمام کیجیے تاکہ فساد کے زمانہ میں حملہ آوروں کو اس وقت تک روک سکیں جب تک کمک آتی ہے۔ اپنی حفاظت کرنا ہمارا حق بھی ہے اور فرض بھی۔ یہ زمانہ ایسا آگیا ہے کہ ہمیں اپنی حفاظت کے لیے ساری تیاریاں اور جتن کرنے چاہییں، نہیں تو جان مال اور آبرو ان میں سے کچھ نہ بچے گا۔

قارئین چھوٹتے ہی یہ سوال کریں گے کہ طاقت حاصل کیسے ہوتی ہے؟ طاقتور بننے کے کئی طریقے ہیں۔ دماغ سے طاقت دستیاب ہوتی ہے اور جسم سے بھی۔ ابتدائے آفرینش میں شانہ و بازو، جانگ اور ٹانگ، پھیپھڑوں اور دل گردے طاقت کے مخزن اور مظہر تھے اگرچہ دماغ نے اس وقت بھی گاہ گاہ اپنے جوہر دکھانے شروع کر دیے تھے۔ جیسے جیسے تہذیب کو فروغ ہوا دماغ کی بالادستی واضح ہوتی چلی گئی اور اب تو دماغ دنیا پر چھا گیا ہے، علوم اور ٹکنولوجی کے ذریعہ لیکن جسم ہنوز نہ مفلوج ہوا ہے نہ بیکار بلکہ دماغ کو اپنے نشوونما کے لیے تندرست جسم درکار ہوتا ہے۔ اہل غرب جو اب کئی صدیوں سے ہم پورب کے ساکنوں پر فائق اور غالب ہیں اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے ایک طرف دماغ کو فروغ دیا۔ دوسری طرف جسم کی بھرسک پرداخت کی۔ کھیلوں اور جسمانی آزمائشوں اور مہم جوئیوں میں وہ جسمانی صحت، پھرتی اور طاقت کی وجہ سے اہل شرق پر بازی

لے گئے۔ لہٰذا ہمیں سب سے پہلے اپنی جسمانی صحت کی طرف دھیان دے کر جسم میں بجلی بھرنی چاہیے۔ ایسی غذا کھایئے جو بدن کا جزو بنے اور صحت، حرکت اور چابکدستی لائے۔ ورزش کیجیے، جسم کو بھدا اور بدقطع اور تساہل پیشہ بنانے سے بچایئے۔ پنجوں میں گرفت، شانوں اور ٹانگوں میں طاقت اور جانگر پیدا کیجیے۔ صحت اور طاقت کا احساس کتنی بڑی نعمت ہے یا یہ احساس کتنا پُر لطف اور حوصلہ پرور ہوتا ہے، یہ ان لوگوں سے پوچھیے جن کو خدا نے ان دونوں سے نوازا ہے۔ کھیلوں میں دل لگایئے، ان میں امتیاز حاصل کیجیے، گھر سے چپساں نہ رہیے، سیاحت کے لیے نکلیے، پہاڑوں پر چڑھیے، سمندروں کو کھنگالیے قطب شمالی اور قطب جنوبی پر کمندیں ڈالیے، خطرات سے کھیلیے۔ سفر سے انسان پختہ ہوتا ہے، خطرات میں کودنے سے اس میں جوانمردی آتی ہے۔ اکھاڑے میں اثر یہ ہے کہ اس کی مٹی سے طاقت پھوٹتی ہے۔ بہرحال جیسی جس کی بساط ہو محنت کرے، کسرت کرے، زور آزمائی کرے۔ افراد اور قومیں اسی طرح بنتی ہیں، آسائشوں اور خانہ نشینی سے قومیں نرم پڑ جاتی ہیں، نرم چارہ بن جاتی ہیں۔ منگول قدرتی طاقتوں کی طرح تھے۔ بادوباراں اور طوفان کی طرح ان کے شہسوار سلطنتوں، مخالفتوں اور تہذیبوں کو روندتے ہوئے، زمیں بوس کرتے ہوئے، آباد دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ گئے۔ وہ ہندستان آئے تو بلبن کی فوج نے ان کے چھکے چھڑا دیے اور انھیں پسپائی پر مجبور کر دیا۔ وہ حریف کو داد دیتے ہوئے واپس گئے، کہتے ہوئے کہ یہ بادشاہ امن کے زمانہ میں بھی اپنی فوجوں کو حرکت میں رکھتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی چلتے چلتے کہہ دی جائے کہ سلطان بلبن کے لشکر اور بابری مسجد ایکشن کمیٹی اور اس کی ہمزاد میں یہی فرق نہیں تھا کہ "یہ گفتار، وہ کردار، یہ ثابت وہ سیّارہ"، تھے بلکہ یہ فرق بھی تھا کہ ایکشن کمیٹی کے قائدین اپنے آسایش کدوں میں بیٹھے رہے اور مسلمانوں کو تہ تیغ کرواتے رہے۔ درآں حالیکہ بلبن نے اپنے چہیتے بیٹے اور جانشیں کو منگولوں کے ٹڈی دل کو روکنے کے لیے بھیجا اور وہ لڑائی میں کام آیا۔ لڑنے لڑانے کا حق اسی کو ہے جو پہلے خود شہید ہونے کے لیے تیار رہے، تب لشکر پر آنچ آنے دے۔ ذہن کی بالادستی، فتح مندی اور فتوحات کا تو کہنا ہی کیا۔ جس نے ذہن اور عقل پر علم سے دھار نہ رکھی، کند چھری کی طرح اس میں کبھی کاٹ ہی نہیں آئی۔ علم کی دوڑ میں ہندستانی مسلمان بہت پیچھے رہ گئے ہیں، اسی وجہ سے وہ سوجھ بوجھ سے محروم ہیں۔ جس کے جی میں آئے انھیں بہکا لے، بھڑکا دے۔ ان کی گرہ میں تو سمجھ اور دور اندیشی نام کی کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ علم ہی طاقت کا سرچشمہ ہے اور مسلمان اسی کو بیچ دیے ہوئے بیٹھے ہیں۔ ان کی

شرحِ خواندگی شرمناک ہے۔ حکومت بھی مطمئن معلوم ہوتی ہے کہ انھیں ان کے حال پر چھوڑ دو، پڑھ لکھ جائیں گے تو دردِ سر بن جائیں گے۔ اپنا حق مانگنے لگیں گے پھر انھیں کھلونے دے کر بہلانا ممکن نہ رہے گا۔ چنانچہ ان کی خواندگی کی شرح کے اعداد و شمار کو حکومت نے بڑے اہتمام کے ساتھ سات پردوں میں چھپا کے رکھا ہے اور پردے اٹھانے کا نام بھی نہیں لیتی۔ لیکن خود ہمیں کیا ہوا ہے، ہم خود جہالت سے نبرد آزما کیوں نہیں ہوتے؟ یاد رکھیے کہ جب تک ہم جاہل رہیں گے، برابر روندے جائیں گے، فریاد کریں گے تو ٹھوکریں کھائیں گے، بر ہم ہوں گے تو گولیوں سے نوازے جائیں گے۔ خدا کے واسطے اور سب مشاغل بھول کر پڑھنا لکھنا سیکھیے، حصولِ علم میں لگ جائیے کہ علم سب سے بڑی طاقت ہے اور جہالت سے بڑھ کر لعنت کوئی نہیں۔ جاہل رہیں گے تو نہ خود کو سمجھیں گے نہ خدا کو سمجھ پائیں گے اور نہ اس کی مخلوق اور اس کی مشیّت کو۔ ہم میں سے ہر پڑھا لکھا یہ عہد کیوں نہیں کر لیتا کہ وہ ہر سال تین چار اَن پڑھوں کو خواندہ بنا دے گا۔ وہ ایسا نہیں کرتا تو اُسے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ مسلمانوں کی پسماندگی اور تباہ حالی اور مظلومی کا شکوہ یا ان کی قیادت کی مذمّت کرتا رہے۔ قیادت بہر حال جماعت کا آئینہ ہوتی ہے، اسی میں سے ابھرتی ہے۔ ہمارے علماء کی ایک بڑی تعداد نے عصری علوم کی اہمیت کو نہ سمجھا نہ سمجھایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مدارس کی تعلیم کا فائدہ بہت محدود ہو کر رہ گیا، بہت سے والدین نے بچّوں کو اسکولوں میں بھیجنے سے احتراز کیا، اور مدارس کے فارغین نیز روجدید زندگی کے مسائل اور ان کی پیچیدگی سے بے بہرہ رہ گئے اور جنھوں نے جدید تعلیم حاصل کی انھیں دین سے مَس نہ ہوا۔ دونوں ادھورے اور ان گھڑ رہ گئے۔

قارئینِ کرام واقف ہوں گے کہ افرادی طاقت صحت اور علم سے بنتی ہے مسلمان اگر ترقی کرنا چاہتے ہیں اور تحقیر اور ترحّم کا ہدف نہیں بننا چاہتے تو انھیں صحت اور علم دونوں کا دیوانہ وار تعاقب کرنا پڑے گا۔ تعلیم شخصیت کے نشوونما اور اطوار واخلاق کے تزکیہ کے لیے ہے، یہ بات ضمنی ہے کہ وہ روزگار بھی دلاتی ہے اور جن دھندوں میں ہم لگے ہوئے ہیں انھیں تابناک بنا سکتی ہے۔ تعلیم کی چرخی میں ہر پیچ کا ما نجھا ہے، اس کے لچھے میں سارے امور اور مسائل کی کنجیاں ہیں۔ اس صدی کے اوائل میں جب ایران میں بادشاہت روبہ زوال تھی اور مشروطہ کی آمد آمد تھی۔ انقلاب پیشہ شعرا نے اس وقت علم کے ترانے لگاتار گائے کہ انھوں نے دشمنِ اوّل جہالت کو ہی قرار دیا تھا۔

رفعِ ما یحتاج ما علم است علم
مرد و زن را رہنما علم است علم

دعلم ہی ہماری ضرورتوں کو پورا کرسکتا ہے، مردوں اور عورتوں کی رہنمائی علم ہی کی روشنی میں ہو پاتی ہے۔ اس کو اب نوئے سال ہونے کو آرہے ہیں لیکن ہندستان کے مسلمان ابھی تک نہیں چیتے۔ جہالت کے دلدل میں وہ اسی طرح لوٹ رہے ہیں۔ اسی وجہ سے ہر محاذ پر دھوکا اور شکست کھا رہے ہیں۔ زندہ رہنا ہے اور عزت کے ساتھ رہنا ہے تو اپنے موجودہ اسکولوں سے بدانتظامی اور خانہ جنگی دور کیجیے، خائن اور خود غرض اور بے شعور منتظمین کو نکال باہر کیجیے، اچھے اچھے نئے اسکول قائم کیجیے۔ یاد رکھیے کہ برادران وطن سے لڑنا ہے تو سڑکوں میں نہ اُتریے، لڑیے تو اسکولوں، کالجوں، مقابلہ کے امتحانوں، لائبریریوں، لیباریٹریوں اور زندگی کے مختلف شعبوں میں لڑیے۔ میدانِ فضیلت میں باہم ٹکرایئے۔ لیاقت میں بازی لے جاکر دکھایئے۔ ذہن کو ذہن سے ٹکرایئے، چنگاریاں اُڑیں گی تو روشنی پیدا ہوگی، آگ نہیں لگے گی جس نے اجودھیا اور بمبئی اور گجرات میں مکانوں کو خاکستر کر دیا اور انسانوں کے جلتے ہوئے گوشت سے فضا کو متعفن۔ اقلیتوں کی صورت حال کی منطق ہی یہ ہے کہ وہ اکثریت سے کہیں زیادہ محنت کرکے لائق و فائق بنیں۔

طاقت مقدار یا تعداد سے نہیں، معیار سے آتی ہے۔ معیار بنتا ہے صحت اور علم سے۔ علم تناسب کا احساس، آگے دیکھنے اور صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت اپنے ساتھ لاتا ہے اور فروعات میں اُلجھنے اور عمر عزیز کو رائیگاں کھونے سے بچاتا ہے۔ بات تو جب ہے کہ لوگ آپ پر رشک کریں، یہ کیا بات ہوئی کہ دنیا آپ پر رحم کرے، ترس کھائے۔

ان کو نہیں معلوم کہ اظہارِ ترحم۔ ان ظلم کے ماروں کو گزرتا ہے گراں اور انتہاپسندوں نے ستم ڈھائے، روشن خیالوں نے ترس کھایا اور ہمدردی کی۔ ہم نے کیا کیا؟ کیا یہی ہمارے لیل و نہار ہیں۔ کیا یہ چکی کے دو پاٹ ہیں؟ علم اور صحت کے علاوہ ایک اور وصف ہے جس سے افرادی اور اجتماعی طاقت بنتی ہے، جس سے قوم یا ملت میں توانائی آتی ہے۔ وہ ہے یقین، عزم، ایمان اپنے مقصد پر یقین، اپنی راست روی پر اعتماد اور خدا کی نصرت پر بھروسا۔

افراد کی شیرازہ بندی اتحاد اور تنظیم سے ہوتی ہے۔ تنظیم اگر شریکِ حال ہو تو کسی جماعت یا گروہ کی مجموعی طاقت افراد کے حاصل جمع سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ اگر یقین ساتھ دے تو یہ ضرب کا حاصل بن جاتی ہے۔ نفاق، حسد، بے تنظیمی اور بے ترتیبی سے شیرازہ بکھر جائے تو کثرتِ تعداد کا اثر منفی ہوتا ہے۔ ایک فرد اگر دوسرے کی کاٹ کرے تو نہ ایک کی اہمیت رہتی ہے نہ دوسرے کی۔ ایک دوسرے کی نفی کرنے لگے تو اجتماعی طاقت کا پہیا صفر پر رک جاتا ہے۔

ہاں اگر فراست اور دور اندیشی ہم رکاب ہوں تو تھوڑی سی تعداد میں برکت آجاتی ہے، طاقت آجاتی ہے، سُوجھ بوجھ ہو تو داخلی طاقت پر (جس کا ذکر آچکا) خارجی طاقت کا ردّا رکھنا دشوار نہیں ہوتا۔ خارجی طاقت ہم حالوں، ہم خیالوں، ہمدردوں سے بہ آسانی اخذ کر سکتے ہیں، خوش ہمسائگی، دور بینی اور حکمت عملی برت کر۔ ہمارے وطن عزیز میں ری پبلک کی بقا اور آبرو اسی میں ہے کہ اقلیتیں اور کمزور طبقے یکجا ہو جائیں اور ایک دوسرے پر ظلم نہ ہونے دیں۔ بدقسمتی سے ہماری اکثریت کا اعمال نامہ یا ٹریک ریکارڈ کمزوروں کے تئیں لائق ستائش نہیں رہا ہے اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ اتحاد کی شکل کیا ہو اور وہ عمل میں کیوں کر آئے۔ انتہائی دُور اندیشی سے ہمارے دستور سازوں نے درج فہرست ذاتوں کو مراعات کی رسّی سے باندھ رکھا ہے۔ اگر ان کا کوئی فرد مسلمان ہو جائے تو وہ ملازمتوں اور قانون ساز مجلسوں میں ریزرویشن سے یکقلم محروم کر دیا جاتا ہے، اگر وہ سکھ یا بدھ مذہب قبول کرے تو یہ مراعات قائم رہتی ہیں۔ اس تفریق کا کوئی جواز نہیں، لیکن ہم نے اس ناانصافی کے خلاف آواز اٹھانے کی جرأت کبھی نہیں کی۔ بہرکیف یہ ڈر ان ذاتوں کو برابر لاحق رہتا ہے کہ اگر انھوں نے اعلا ذاتوں سے ہٹ کر مسلمانوں کے ساتھ پینگ بڑھائے تو ارباب اختیار جو اعلا ذاتوں سے یا ان کے زیر اثر ہیں مراعات کی تجدید کو روک دیں گے۔ لہٰذا درج فہرست ذاتیں اگر مسلمانوں کی طرف کبھی رخ کرتی بھی ہیں تو بہت سے تحفظات کے ساتھ: اس امکان پر اونچے سُروں میں ان کے نیتا جو باتیں کبھی کبھی کرتے ہیں ان کا روئے سخن اکثریت کی اعلا ذاتوں کی طرف ہوتا ہے، مسلمانوں کی طرف نہیں، تاکہ اکثریت کو ان کے مسلمانوں کی گود میں بیٹھ جانے کا خوف راہ راست پر رکھتے، اور مراعات پر نظر ثانی نہ کرنے دے۔ پسماندہ طبقہ کے لیے منڈل مراعات کا اعلان انھیں بالآخر اعلا ذاتی ہندوؤں کا حلقہ بگوش بنا دے گا۔ بالآخر مراعات اور ریزرویشن سے محروم یا تو مسلمان رہ جائیں گے یا اعلاذات کے ہندو اور پارسی سکھ، عیسائی جو سب کے سب خوش حال اور ترقی یافتہ ہیں اور مسلمان جو نہایت پچھڑے ہوئے ہیں۔ ایک کو مراعات کی ضرورت ہی نہیں، اور دوسرے کی گاڑی مراعات کے بغیر چل ہی نہیں پائے گی۔ مسلمان تو اتنے کمزور، بے سُدھ اور بے یارو رہبر ہیں کہ وہ ان تحفظات کی مانگ بھی ابھی نہیں کر پائے جن پر ان کا آرٹیکل ۱۶ کے تحت حق ہے۔ ایسی پیچیدہ صورت حال میں بغیر رہبری فراست کے کام نہیں چلتا اور یہ ہمارے یہاں معدوم ہے۔ فراست رہبری کی ضرورت چناؤ اور تباہی کے وقت اور زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ کن سیاسی پارٹیوں سے معاہدہ کیا جائے، کس وضع کا، اور کیسے؟ اپنے ووٹوں کو کس طرح استعمال کیا جائے کہ ہماری ترجمانی مرکزی اور ریاستی ایوانوں میں مؤثر طریقے سے ہوسکے۔ اس وقت تو یہ حال ہے کہ پارلیمنٹ میں ہمارے

نمائندوں کی تعداد آبادی تناسب کے اعتبار سے بہت کم ہے اور ہمارے نمائندے ہماری جرأت مندانہ اور دانشورانہ نمائندگی کے نہ اہل ہیں، نہ خواہاں۔ انھیں صرف بقا اور انتفاع کی فکر ہے۔ روشن خیالوں، ترقی پسندوں اور سیکولر مزاجوں سے ہمارا ارتباط بڑھنا چاہیے کہ انھوں نے ہمیشہ ہمارا ساتھ دیا ہے ہمارے حق میں آواز اٹھائی ہے۔ بہرکیف مسلمانوں کو سادہ لوحی مصالحت کوشی اور خیراندیشی کی رو میں طاقت کی بے رحم منطق کو زنہار نہ بھولنا چاہیے، کہ اب تک یہ بھول ان کو بہت مہنگی پڑی ہے۔

(۱۹ رجنوری ۹۳ء)

زبانی جمع خرچ سے کام نہیں بنے گا

راقم سطور ان خوش بینوں میں ہے جو آفت میں رحمت کے پہلو ڈھونڈ لیتے ہیں۔ چنانچہ اس قیامت کے بعد جو بابری مسجد کے ساتھ مسلمانوں اور ملک پر ٹوٹی، اسے یقین ہو گیا تھا کہ مسلمان اب جاگیں گے، اب تو سنبھلیں گے انھیں پے در پے اتنے جھٹکے لگے ہیں اور عرصۂ حیات ان پر اس حد تک تنگ ہو گیا ہے کہ اب وہ تہیا کر لیں گے اور کمر کس لیں گے اور بے حسی اور نفسی نفسی کو چھوڑ کر علاقہ مندی، سنجیدگی، محنت اور لگن کو اختیار کر لیں گے۔ لیکن اس زبردست المیے کو اب سوا دو مہینے ہو گئے۔ عمل کی شکل کہیں بھی نظر نہیں آئی۔ جا بجا جلسے ہوئے، بیٹھکیں ہوئیں، سیمنار ہوئے، کانفرنسیں ہوئیں پالیسی، حکمتِ عملی، سیاست، روشن خیالی، قومی یک جہتی کی باتیں ہوئیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ان سے ڈھارس ضرور بندھی، یہ آہٹ بھی ملی کہ مسلمانوں کو روشن خیالوں اور کمزوروں کے ساتھ سمپرک بڑھانا چاہیے کہ ان کا حشر انھی کے ساتھ ہوگا۔

لیکن یہ بات ابھی تک ان کے حلق سے نیچے نہیں اُتری کہ انھیں خود اپنے گھر کو سنوارنا اور خود کو سدھارنا اور اپنی جمعیت کو مضبوط کرنا ہے۔ اگر وہ جاہل غافل، کاہل اور خود غرض اور منتشر رہے تو کمزور بھی ان سے دور بھاگیں گے، روشن خیال ان کو حقارت کی نظر سے دیکھیں گے اور طاقتور اور اجارہ دار انھیں ٹھوکریں لگائیں گے۔ ہاں، اس کا کوئی علاج نہیں کہ ہمیں یہ کچھ نظر نہ آئے اور ہم خود کو خلاصۂ کائنات اور انسانیت کی آنکھوں کا تل سمجھتے رہیں۔ بابر نے اپنی سوانح عمری بابر نامہ میں ایک ہم عصر شاعر بابیؔ کا ذکر کیا ہے۔ اس کے حریف بادشاہ نے اپنے پاؤں کو شوخی سے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا کہ " فی زمانہ شاعروں کی اتنی کثرت ہے کہ ذرا پیر پھیلاؤ تو کسی نہ کسی شاعر کی پشت سے ٹکراتا ہے۔" بابیؔ نے تڑک کر جواب دیا، "لیکن وہ پیر واپس نہیں آتا"، محفل سے اٹھ گیا اور پھر دربار کی طرف رُخ نہیں کیا۔

اس نے اُس غیرت کا ثبوت دیا جو انسان کو انسان بناتی ہے۔ بے غیرت انسان جانوروں سے بدتر ہوتے ہیں۔ حیرت ہے، ہندستانی مسلمان غیرت کا ثبوت کیوں نہیں دیتے۔ وقتی طور پر وہ برہم و بیدار ہو جاتے ہیں لیکن جلد ہی سب کچھ بھول کر اپنی اوقات پر آجاتے ہیں۔ ۶ دسمبر اور اس کے ملک گیر فسادات کے بعد جنھوں نے جنوری تک طول پکڑ کر عروس البلاد کو مسلمانوں کے لیے جہنم بنا دیا، جب انھیں ہندوؤں کی ایک شقاوت پیشہ جماعت نے چُن چُن کر پولیس کے سرگرم تعاون سے تیرِ ستم کا ہدف بنایا، مسلمانوں نے کیا کیا؟ ماتم کیا، فریاد کیا، مصیبت زدوں کی مدد کی۔ اور بڑے بڑے شہروں میں مجلسیں کیں، مشورے کیے۔ لیکن کوئی کام بھی انھوں نے ایسا نہیں کیا جس سے کسی جماعت کا شیرازہ بندھتا ہے، اس میں طاقت آتی ہے، وہ باخبر بنتی ہے، توانا ہوتی ہے۔

سب کی زبان پر یہ بات آرہی ہے کہ مسلمانوں کی بدحالی کا بنیادی سبب جہالت ہے۔ کیا انھوں نے حالیہ قیامت کے نتیجہ میں کوئی زبردست مہم جہالت دور کرنے کے لیے چلائی؟ کیا انھوں نے نئے اسکول کھولے؟ کیا انھوں نے تنظیم اور ارتباط کے ساتھ عام اچھے اسکولوں میں مسلمان بچّوں کے داخلہ کے لیے کوئی اہتمام کیا! کیا انھوں نے خود اپنے اسکولوں کو معیار کی پستی سے اُوپر اٹھانے کے لیے کوئی جتن کیے؟ کیا انھوں نے دینی تعلیم کے نصاب میں عصری آگہی کو محکم انداز سے شامل کیا؟ کیا انھوں نے لڑکیوں کی تعلیم کو تحریک کی شکل دی اور لڑکیوں کے لیے اسکول اور ہوسٹل کھولنے کی داغ بیل ڈالی؟ کیا انھوں نے اس زبردست خطرہ کا ادراک کرتے ہوئے جو انھیں درپیش ہے سب کچھ چھوڑ کر تعلیم کا سروسامان کیا؟ کیا انھوں نے جہالت سے ناتہ توڑنے کی طرف ایک قدم بھی بڑھایا؟ کیا محلوں اور مسجدوں میں فی سبیل اللہ بچوں کو پڑھانے اور ان کو وہ تعلیمی مدد دینے کا انتظام کیا گیا جو انھیں بالعموم گھروں میں نہیں مل پاتی؟ اصلاحی تربیت یا ریمیڈیل کوچنگ کے لیے کیا شہر شہر بندوبست کیا گیا؟ کیا حکومت کے جو فرائض اور پیمان اس ضمن میں ہیں اس کا مطالبہ کرنے کے لیے ہم نے سرکار کے دروازے پر دستک دی؟ دستک دینے کا مطلب آپ سمجھتے ہیں؟ جمہوریت میں دستک وہی سنی جاتی ہے جو ہزاروں لاکھوں ہاتھوں سے دی جائے۔ اس عمل میں فرض کفایہ شامل نہیں ہوتا۔ راقم سطور ایک عرصہ سے سرکار کو اقلیتوں کے تئیں اس کے تعلیمی فرائض اور وعدے یاد دلا رہا ہے۔ حکومت کے درِ دولت پر دستک دیتا رہا۔ حکومت اس کی بات کیوں سننے لگی؟ ایک ہاتھ کی دستک کبھی مسموع نہیں ہوتی۔ بادشاہوں اور مہاراجاؤں کے طرزِ حکومت میں لاکھ خرابیاں سہی لیکن وہاں ایک آدمی کی فریاد بھی

سُن لی جاتی تھی، جمہوری حکومت کسی ایسی بات کو قابل غور سمجھتی ہی نہیں جس کے پیچھے ایک جمِ غفیر نہ ہو، اور جم غفیر اکٹھا کرنے کے لیے سیاست مطلوب ہے بصیرت نہیں۔ راقم نے تنہائی کے اناکدہ سے نکل کر بعض وزیروں اور پارلیمنٹ کے بعض ممبروں سے رجوع کیا۔ وزیروں کو ایسے مسائل میں کوئی دلچسپی نہیں جو ملت کے دیرپا اور دوررس مفاد میں ہوں۔ پارلیمنٹ کے ایک ممبر پر "محنت" کی گئی، انھیں تعلیمی مسائل اور شکایات سے آگاہ کیا گیا تو قرائن کہتے ہیں کہ انھوں نے انھیں متعلقہ وزیر پر اثر انداز ہونے اور اپنی اہمیت بڑھانے کے لیے استعمال کیا۔

مگر یہ بات اس زمانے کی ہے جب ایودھیا کا پہاڑ ہم پر نہیں ٹوٹا تھا، اتنی بڑی مصیبت کے بعد امید یہ کی جاتی تھی بلکہ واثق یقین تھا کہ مسلمان تلملا کر اٹھیں گے اور تعلیم اور تعمیر میں لگ جائیں گے۔ لیکن وہ لگے ہوئے ہیں بے کار کی بحثوں میں۔ دلی بہر حال ہندستان کا دل ہے، پڑھے لکھے باخبر مسلمانوں نے مختلف حلقوں اور حصاروں میں جمع ہو کر غور کیا اور کر رہے ہیں کہ کیا کیا جائے۔ راقم سطور کو کئی جگہ بلایا گیا اور کئی جگہوں کی اس نے آہٹ بھی لی، لیکن وہ کہیں سے مطمئن ہو کر نہیں اٹھا۔ ابھی تک اس غور و فکر اور گفت و شنید کی فضا "کربیانہ" ہے۔ عمل کا رُوئے زیبا اسے ابھی کہیں نظر نہیں آیا۔ کہیں تذکرہ ہو رہا ہے کہ ہم قانونی حقوق کے لیے لابی کریں گے۔ گویا ایسا کر لیا تو ہماری کمزوری اور ہماری بے اثری دور ہو جائے گی۔ کہیں ان مذاکروں کے آسمان سے ستارے ٹوٹ کر حکومت کے در و بام کو روشن کرنے کے لیے چلے گئے۔ کہیں تذکرہ ہے کہ فلاں سیاسی پارٹی سے الحاق کرنے میں ہی عافیت ہوگی۔

ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ ہم نے ہاتھ اور آستین میلی کرنے کا ہُنر ابھی تک نہیں سیکھا، نہ ہم میں عوام پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت ہے۔ گھوم پھر کر دھیان راقم کا اس طرف جاتا ہے کہ بڑے کام، پھیلے ہوئے کام، ملک گیر کام تقاضا کرتے ہیں کہ بیشتر لوگ کچھ وقت اور کچھ لوگ سارا وقت ان کے لیے صَرف کرنے کو تیار ہوں۔ خدارا اس طرف توجہ کیجیے، ورنہ غور و فکر کرنے اور آہیں بھرنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

راقم سطور ایک مدّت سے التماس کر رہا ہے کہ بابری مسجد ہمارے ہاتھ سے گئی اس کو صبر کر لیجیے۔ ہم پر اس کی حفاظت کا جو فرض تھا ہم نے اپنی وسعت اور طاقت اور تنظیم اور بصیرت کے بقدر ادا کر دیا۔ ظالموں نے طاقت اور کثرت کے نشے میں مسجد کو منہدم کر دیا۔ یہ گناہ گار سمجھتا ہے کہ اب ہم سے کوئی مواخذہ اس ضمن میں نہیں ہوگا، اور پھر ہزاروں ہندستانی

مسلمان اس پر نثار بھی تو ہو گئے۔ راقم نے شروع میں ہی یہ گزارش کی تھی کہ حمیت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم مسجد کی تعمیر کے مسئلہ میں کوئی دلچسپی نہ لیں، ملک چاہے اسے بنائے، چاہے نہ بنائے، چاہے وہیں بنائے چاہے کسی دوسری جگہ بنائے۔ اس مسئلہ کو ہم ملک کے ضمیر کے سپرد کرتے ہیں۔ اسے دکھ ہے کہ اس کی بات کی سماعت نہ ہو پائی۔ مطالبہ کیا گیا کہ وزیر اعظم اپنا وعدہ پورا کریں اور مسجد وہیں بنائیں۔ گویا ہمیں مسلمانوں کی عافیت اور سلامتی سے زیادہ فکر پرائم منسٹر کی امیج یا شبیہہ کی ہے۔ آپ جتنا امتحان ان کا لیں گے اتنی ہی شبیہہ ان کی بگڑتی چلی جائے گی۔ انھیں آزمائش اور خود کو ہلاکت میں نہ ڈالیے۔ یہ نامہ سیاہ سمجھتا ہے کہ ملی کونسل اور پرسنل لا بورڈ اور ان کی ہم خیال دوسری تنظیمیں اس مسئلہ میں غلطی پر ہیں۔ قیادت بھی انوکھی شے ہے۔ وہ غلطی کرتی ہے تو اس کی سزا اسے نہیں ملتی دوسروں کو ملتی ہے۔ خطا رہبر کرے سزا رہرو کو ملے گی۔

حال ہی میں ہمارے ایک معزز رہنما نے نزاعی مساجد کے سلسلہ میں ایک فارمولا سنگھ پریوار کی خدمت میں پیش کیا ہے اس میں راقم سطور کے دیرینہ موقف سے ایک فاصلہ تک اتفاق کیا گیا ہے۔ یعنی مسجد کی اسی جگہ پر تعمیر پر اصرار نہ کیا جائے اور مسئلہ کو ملک کے ضمیر پر چھوڑ دیا جائے لیکن راقم سطور یہ سمجھتا ہے کہ اس وقت بقیہ نزاعی مساجد کے مسئلہ کو نہ چھیڑا جائے یہ ساری باتیں بعد کی ہیں۔ یہ وقت کام کرنے کا ہے خود کو اس لائق بنانے کا ہے کہ لوگ ہماری بات سنیں اور اس کو وزن دیں۔ کم سے کم انھیں یہ احساس تو ہو جائے کہ مصیبت نے ہمیں یکجا اور گرم عمل کر دیا ہے۔ انھیں یہ احساس نہ ہونا چاہیے کہ خونریزیوں نے ہماری ریڑھ کی ہڈی توڑ دی ہے اور اب ہم ان کی باتوں کو سننے، سمجھنے اور ماننے کے لائق ہو گئے ہیں۔ بھاجپا کی طرف سے یہ کہا گیا کہ یہ تجویز شری اڈوانی نے پہلے ہی مسلمانوں کے سامنے رکھی تھی۔ راقم حروف کے پاس اس بات کا دستاویزی ثبوت ہے کہ شری اڈوانی نے تجویز نہیں رکھی تھی صرف ٹٹولا تھا، کمند پھینکی تھی۔ ان کی یہ پیش کش جیسے ہی منظر عام پر آئی علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے تین سابق وائس چانسلروں یعنی کرنل بشیر حسین زیدی (مرحوم)، بدرالدین طیب جی اور سید حامد نے ایک خط شری اڈوانی صاحب محترم کی خدمت میں ارسال کیا کہ اس سلسلہ میں وضاحت حاصل کرنے کے لیے ہم آپ سے ملنا چاہیں گے۔ وہاں یہ عالم، کاٹو تو لہو نہیں بدن میں، یعنی جواب ندارد، اور اس کے بعد بہ لطائف الحیل اس پیش کش سے کنارہ کشی۔ ہمارا حریف بہت زیرک ہے، اس کا

ہمیں آج تک اندازہ نہیں ہوا۔ اور ہم ٹھہرے سادہ لوح اور گلِ محمد کی طرح جُنبش ناپذیر۔

جس باخبر اور فکر مند مسلمان سے بات کیجیے وہ یہی پوچھے گا کیا کیا جائے! جواب یہ ہے کہ اتنا کچھ تو کرنے کو ہے اور آپ پوچھ رہے ہیں کیا کیا جائے کچھ کرنے کی واقعی نیّت ہے تو آئیے، بسم اللہ۔

(۱) جہالت دور کیجیے، خواندگی کی مہم میں لگ جایئے، اپنے تعلیمی معیار کو لاکھ جتن کرکے اوپر اٹھایئے۔ اسکول کھولیے۔ ہوسٹل کھولیے، بچّوں کو اچھے اسکولوں میں داخلے دلوایئے۔

(۲) اپنے معاشرہ کی اصلاح کیجیے، اسراف سے دامن بچایئے، اُن رسموں سے پیچھا چھڑایئے جس میں وقت اور پیسے کے زیاں کے سوا کچھ نہیں۔ یہ پیسہ تعلیم اور تعمیر میں لگایئے، اپنے اندازِ فکر اور اپنی سمتِ نظر کو بدلیے۔ آگے کی طرف دیکھیے، تعمیری انداز سے دیکھیے۔

(۳) مل کر مطالبہ کیجیے کہ جن لوگوں نے گزشتہ ڈھائی تین ماہ میں مسلمانوں پر ظلم کیے ہیں اس کی فوری جانچ کی جائے اور انھیں کیفرِ کردار کو پہنچایا جائے۔ یعنی ان کے ضمن میں ضروری قانونی کارروائی کی جائے، اور جو اکھڑ گئے ہیں انھیں پھر سے سکون اور عافیت کے ماحول میں آباد کیا جائے۔

(۴) منظم ہوکر مانگ کیجیے کہ ملک کے درست انتظام کی خاطر (بغیر کسی آئینی تذبذب یا رکاوٹ کے) پولیس اور متعلقہ فورسیز میں اقلیتوں کی ۵۰ فی صد نمایندگی کو تسلیم کیا جائے اور بہ تدریج عمل میں لایا جائے۔

(۵) ہندو مسلم اتحاد کے لیے ہر ممکن کوشش کی جائے۔

(۶) مسلمانوں کی بابت ہندوؤں میں جو غلط فہمیاں ہیں انھیں دُور کرنا مسلمانوں اور ملک کے دوسرے خیر اندیشوں کا پہلا فرض ہے۔

(۷) روشن خیالوں، رواداروں، انصاف پسندوں اور کمزوروں اور مظلوموں کے ساتھ مسلمانوں کو ناتہ جوڑنا چاہیے۔

(۸) ہر شہر اور ہر بستی میں مسلمانوں کے مقتدر اور بااثر حضرات کا یہ فرض ہوگا کہ وہ مقامی اہلِ اختیار سے تعلقات قائم کریں اور بنائے رکھیں تاکہ مصیبت کے وقت ان کی وہاں تک آسانی سے پہنچ ہوسکے اور فریاد کی شنوائی ہوسکے۔ اور ایسے وقت کے لیے باہمی رابطہ اور اطلاع کی سبیل بھی کی جائے۔

(۹) پولیس اور دوسری فورسیز کو چھوٹتے ہی بُرا سمجھنا اور کہنا مناسب نہ ہوگا کیونکہ اس طرح انھیں اور ضد ہوجاتی ہے۔ ان کے ساتھ ایسا رُخ

اختیار کیا جائے کہ وہ غیر جانب داری اور انصاف پر مجبور ہو جائیں۔ کوشش کرنا ہمارا فرض ہے۔ کچھ نہ کچھ تو اثر ہو گا ہی۔ کدورت اور نا انصافی میں کچھ تو کمی ہو گی۔ زبان کو زیب نہیں دیتا کہ دانتوں سے ٹکرائے۔

(۱۰) اپنی اور اپنے متعلقین اور منحصرین اور اپنی املاک کی حفاظت کرنا ہر شہری کا حق ہے اور فرض بھی۔ چنانچہ مسلمانوں کو "پہلے دفاع" یا فرسٹ ڈیفنس کا اہتمام ضرور کرنا چاہیے۔ پہلے دفاع سے مراد وہ عمل ہے جو پولیس کے آنے تک ان کی حفاظت اور سلامتی کا ضامن ہو۔

(۱۱) یہ بھی طے کر لیا جائے کہ اب جذبات کے بجائے ہم عقل سے کام لیا کریں گے۔ ہر فیصلہ سوچ سمجھ اور پرکھ کر کریں گے۔ اَن سوچے فیصلوں نے ہمیں یہاں تک پہنچا دیا ہے۔

(۱۲) ایم پی اور ایم ایل اے ایسے چُنیے جن کے دل میں ملک و ملت کا تھوڑا بہت درد ہو اور جو اپنی ذات کو خلاصۂ کائنات نہ سمجھتے ہوں اور جو اپنی ذاتی اغراض، اقتدار اور نام و نمود پر ملّت کے مفاد کو قدرے بالا رکھیں۔

یہ سب کچھ کہہ دینا آسان ہے اسے انجام دینا مشکل ہے اس کے لیے محنت اور ایثار دونوں درکار ہیں۔ یہ کام مرکز سے نہیں ہو گا۔ گاؤں گاؤں، قریہ قریہ شہر شہر، محلہ محلہ، کام کیا گیا تو مجموعی نتائج انقلاب آفریں ہوں گے۔ اور اگر کسی راہنما کا یا سرکار کے گوشۂ خاطر کا انتظار کیا گیا تو وہی ہو گا جو اب تک ہوتا چلا آیا ہے۔ یعنی زوال کی طرف تیز روی۔ یہ کام ہم میں سے ہر شخص کو اپنی جگہ پر اپنے حلقہ میں اپنی بساط بھر کرنے ہیں۔ یہ زوال کے روکنے اور فلاح و اصلاح کا آخری موقع ہے یہ ہماری مرضی کہ اس موقع کو گرفت میں لے لیں یا اسے ہاتھ سے جانے دیں۔ گرم چوٹ کو ٹھنڈا ہو جانے دیں۔ خدا را کچھ تو سوچیے سوائے باتوں کے۔

مسلمانوں کی نمائندگی

ہندستانی مسلمانوں کی قیادت جائز طور پر طنز و تعریض کا ہدف بنائی جارہی ہے عام طور پر مسلم رہنماؤں نے مسلمانوں کو کچھ دیا نہیں، وہ ان سے لیتے ہی رہے۔ انھوں نے عوام سے ذاتی فائدہ اٹھانے میں کبھی دریغ نہیں کیا۔ ذرا دیر کو بھی یہ نہیں سوچا کہ قیادت کا فرض یہ بھی ہے کہ عوام کو پستی اور پسماندگی اور جہالت سے نجات دلائے اور انھیں ترقی، خوشحالی اور باخبری کے راستے پر ڈال دے۔ مسلمانوں کے رہنما یہ سوچ کر چلے کہ قیادت سیاسی داؤ پیچ کے محور پر گردش کرتی ہے۔ سیاست کی بساط پر انھوں نے چالیں چلیں اور مطمئن ہو گئے کہ رہنمائی کا حق ادا ہو گیا۔ ان میں سے کچھ نے پیسا کمایا، کچھ نے نام کمایا، کچھ کے ہاتھ اثر و اقتدار آیا کچھ نے اپنے اور اپنوں کے بہت سے کام نکلوائے۔ یہ سب کچھ ہو گیا تو اب اور کیا چاہیے؟ جس ملت کی رہبری کا وہ دم بھرتے تھے، اس کے لیے انھوں نے کچھ نہیں کیا۔ لیکن ملت میں اپنا اثر برقرار رکھنے کے لیے وہ آوازیں بلند کرتے رہے، اپنے اخلاص اور ایثار کے تذکرے کرتے یا کراتے رہے۔

گزشتہ ۳۵ سالوں سے تو کیفیت یہی ہے۔ اس دوران ایک رہبر بھی ایسا نہیں اٹھا جو ملک گیر قد و قامت رکھتا ہو۔ زیادہ تر تو ریاست کی قیادت کی سطح تک بھی نہیں پہنچ پائے۔ یہ لوگ بغیر خدمت کیے مخدوم بن گئے، صرف اس وجہ سے کہ حکومتِ وقت کی نظر انتخاب ان پر پڑ گئی تھی، اس نے گویا انھیں مسلمانوں کا لیڈر تسلیم کر لیا، قبل اس کے کہ خود مسلمان انھیں تسلیم کرتے۔ ان کے تئیں حکومت کے گوشۂ خاطر کو مشتہر اخباروں نے کر دیا۔ بس یہیں ان کی لیڈری پر مُہر لگ گئی۔ یہ قیادت ناک سے آگے نہیں دیکھ سکی، نہ کھال کے پار جا سکی۔ اسے نہ زندگی کی تیز رفتاری کی آہٹ ملی تھی، نہ اپنے وطن کی صورت حالات اور اس کے مسائل کا احساس تھا۔ جن عوام کی وہ اگوا تھی ان میں سے بیشتر اَن پڑھ تھے۔ اس لیے ان کے ذہنوں میں باریک بینی اور دور اندیشی کا گزر بھی نہیں ہوا۔ انھوں نے سوچا، سوچ کر کیا کریں گے۔ کون کاوش کرے۔ گاڑی تو یوں بھی چل رہی ہے

(جس طرح چل رہی ہے ہم سب جانتے ہیں)۔ ہمارے عوام اور ان کے رہنما ایک ناؤ میں سوار تھے، اور اب بھی ہیں۔ وہ ناؤ ہے ماضی میں زندگی گزارنے کی، جذبات کی رَو میں بہنے کی۔ ہمارے رہنما وہ بات کہتے ہیں جو عوام کو پسند ہو۔ عوام اسی کو لیڈر مانتے ہیں جو ان کی من پسند بات کہے، چاہے وہ بات کتنی ہی سطحی ہو اور اس کو مان لینے، اس پر چلنے کا انجام کتنا ہی بھیانک ثابت کیوں نہ ہو۔ ہمارے رہنما صرف دل سے کام لیتے ہیں اور ان کو چاہنے والے، ان کے ماننے والے وہی بات سنتے چلے آئے ہیں جو دل کو بھلی لگے اور کوئی بات وہ سننے کو تیار نہیں ہیں۔ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔ دماغ کو یہ لوگ بیچ میں آنے ہی نہیں دیتے، نہ رہبر نہ رہرو۔ عقل کو یہ لوگ گھر میں گھسنے ہی نہیں دیتے کیونکہ عقل ہر قدم پر تکلیف دہ سوالات اٹھاتی ہے۔ پوچھتی ہے کہ جو فیصلہ کرنے جا رہے ہو، اس کا انجام کیا ہوگا اور انجام کی فکر کو لوگ ضعفِ ایمان سمجھ بیٹھے ہیں۔ ہمارا رخ پیہم یہی ہے۔

ہر چہ باداباد ما کشتی در آب انداختیم

(اب تو جو کچھ ہو سو ہو، ہم نے تو ناؤ پانی میں ڈال دی)

ہم سے کاش کوئی پوچھتا کہ خشکی پر رہنے والوں (ربع مسکوں کے باشندوں) نے جب سے تری سے ناتہ جوڑا ہے، جب سے انھوں نے ندی اور سمندر کے سینہ کو چیرا ہے، اس وقت سے آج تک کبھی ایسا ہوا بھی ہے کہ کسی ماجھی نے بغیر ہوا کا رخ دیکھے، بغیر ساز و سامان سے خود کو لیس کیے ناؤ پانی میں ڈالی ہو؟ جو کوئی ایسا کرے گا، خودکشی کو دعوت دے گا، تباہی کو گلے لگائے گا۔ اب تو ایک عرصے سے ہم یہی کرتے رہے ہیں اور پچھلے پینتیس (۳۵) سال میں بالعموم اور گزشتہ سات سال میں بالخصوص ہم نے اس ہلاکت آفریں طرزِ عمل کی لے کو بہت تیز کر دیا ہے۔ ہمارے یہاں ایک کہاوت ہے۔

:چڑھ جا بیٹا سولی پر رام بھلی کریں گے۔

ہم یہ نہیں سوچتے کہ جو شخص سولی پر چڑھ رہا ہے، اس کی بھلائی اسی میں ہے، اسی میں اس کی کامیابی ہے کہ سولی کا پھندا اس کی گردن کو زور سے بھینچ لے جب ایسا ہو جاتا ہے تو ہمیں افسوس ناک حیرت ہوتی ہے کہ رام نے بھلی کیوں نہیں کی۔ ہم یہ نہیں سوچتے کہ اسباب و نتائج کا باہمی رشتہ اگر ٹوٹ جائے تو زندگی میں نہ قرار باقی رہتا ہے نہ ثبات، نہ سمت، نہ اعتبار۔

اب اس قیادت کی بات ہو جائے جسے مجالسِ قانون ساز کی رکنیت کہتے ہیں، جہاں رہبر ترجمانی پر مامور ہوتا ہے۔ مسلمانوں کا جہاں تک تعلق ہے، نمایندگی کی اینٹ شروع سے کج رکھی گئی ہے۔ ان کی اپنی الگ کوئی سیاسی پارٹی نہیں ہے اور دبے ہوئے حالات میں ہو بھی نہیں سکتی۔ جنوب میں بلکہ کیرالا

ہیں مسلم لیگ ہے لیکن اس کی نوعیت علاقائی ہے اور اس کا شمار باقیات میں ہے۔ مان لیجیے کہ مسلمانوں کی واقعی کوئی سیاسی پارٹی ہوتی جو اسلام کے نام پر ووٹ مانگتی تو دو چار حلقہ ہائے انتخاب یا چھیتروں کو چھوڑ کر وہ چنے ہی نہیں جا سکتے تھے۔ یوں بھی اس طرح وہ ملک کے مشترکہ مفادات اور مصالح سے کٹ کر بیٹھ جاتے، اسی لیے ملک نے مخلوط انتخاب کا راستہ چُنا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پارلیمنٹ اور ریاستی لیجسلیچر کے مسلمان ممبران کیا صرف اپنی پارٹی کی پالیسی کی پیروی کریں گے یا جب پارٹی کی پالیسی اور عمل کو مسلمانوں کے لیے مضر پائیں گے تو اس کے خلاف احتجاج کریں گے؟ ایسے احتجاج کی انتہائی شکل کیا ہو سکتی ہے؟ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ مسلمانوں کی رائے عامّہ ان مسلمانوں کو جو چناؤ لڑنا چاہتے ہوں اس بات کی پابند کر دے کہ اگر کوئی مسئلہ مسلمانوں کے مفاد کے خلاف اٹھایا پارٹی نے کوئی ایسی پالیسی اختیار کی جو ان کی نظر میں مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہونے والی ہے، تو وہ اس مسئلہ پر پارٹی کے موقف سے ہٹ کر اپنی آزاد رائے کا استعمال کریں گے؟ ہونا تو یہی چاہیے ورنہ مسلمانوں کی نمایندگی کا مفہوم ہی کیا رہ گیا۔ ہمارے امیدواروں کو اپنی پارٹیوں پر یہ بات ٹکٹ قبول کرنے سے پہلے ہی واضح کر دینی چاہیے کہ مسلمانوں کے مسائل میں پارٹی کا تازیانہ (وہپ) نہیں چلے گا وہاں ووٹنگ کے وقت وہ ضمیر کے تابع فرمان ہوں گے۔ احتجاج کی ادنا شکل ہے ووٹ دینے سے گریز اور انتہائی شکل ممبری سے استعفا۔

حال ہی میں ہندستان کے مسلمانوں پر ایک قیامت ٹوٹ گئی۔ ان کی ایک عبادت گاہ کو کثرتِ تعداد کے زور میں اور سرکار اور اس کی پولیس کے بل پر پوری تیاریوں کے بعد، منصوبہ بند ڈھنگ سے ڈھا دیا گیا۔ ہندستان کے گوشے گوشے میں مسلمان بے حس ہو کر سڑکوں پر آ گئے، ان کو پولیس نے بھون ڈالا، اور پھر ایک طرفہ خوں ریزی اور اجتماعی عصمت دری کا شرمناک سلسلہ ہمارے کئی شہروں میں شروع ہو گیا۔ مرکزی حکومت نے دانستہ یا نادانستہ مسجد کو منہدم ہونے دیا، اور اس کی جگہ شرافت اور تہذیب کے دشمنوں کے ہاتھوں راتوں رات وہ چبوترہ بننے دیا جس پر مورتیاں رکھ دی گئیں۔ اگر مرکزی حکومت نے یہ سب کچھ جان بوجھ کر کیا تو اس نے مسلم دشمنی کا ثبوت دیا جس کا جواز کسی جمہوری ملک کے لیے نہیں ہے۔ اگر یہ سب کچھ اس کے علم اور ارادے کے بغیر ظہور میں آیا تو ایسی بے اٹکل، بے شعور اور نا اہل حکومت کو ایک لمحہ بھی قائم رہنے کا حق نہیں رکھنی۔

ایسے زبردست حادثہ کے بعد مسلمان وزرا اور پارلیمنٹ کے مسلمان ممبروں نے کیا کیا؟ وزرا میں سے ایک نے بہت پہلے یہ اعلان کیا تھا کہ اگر بابری مسجد کو کچھ

بھی نقصان پہنچا تو وہ استعفا دے دیں گے۔ایک دوسرے وزیر باتدبیر نے کہا کہ مسلم پرسنل لا بورڈ نے اگر ان سے استعفا دینے کے لیے کہا تو وہ مستعفی ہو جائیں گے۔ ان دونوں اشخاص میں سے کسی نے استعفا نہیں دیا، حالانکہ بابری مسجد شہید کر دی گئی اور پرسنل لا بورڈ کا عندیہ بالکل واضح ہو گیا۔ بورڈ نے اتنی احتیاط ضرور برتی کہ باضابطہ استعفا کا مطالبہ نہیں کیا۔اس طرح اس کا بھرم رہ گیا۔بعض ممبروں سے جب استعفا کی بات کی گئی تو ان کی طرف سے یہ کہا گیا کہ ان کی کانسٹی ٹوایننسی مشترک ہے۔ انھیں مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں نے بھی چُنا ہے۔مسلمانوں کے کسی مسئلہ پر بطورِ احتجاج استعفا دینا ان غیر مسلموں کے ساتھ زیادتی ہوگی۔اس کا مفہوم تو یہ ہوا کہ مسلمان ممبر مسلمانوں کے مسائل میں مؤثر دلچسپی لینے سے گریز کرتے رہیں گے اور جہاں وہ یہ سمجھیں گے کہ ان کے مسلمان اور ہندو ووٹروں کی رائے میں باہم ٹکراؤ ہے تو وہ یا تو چُپ سادھ لیں گے یا ووٹروں کی اکثریت کے ساتھ جائیں گے۔

ایسے میں غریب مسلمانوں کی نمایندگی کرنے کیا فرشتے آسمان سے اُتریں گے؟ ہمارے بعض ایم پی اور ایم ایل اے حضرات کا یہ استدلال شرمناک نہ ہوتا تو مضحکہ خیز ہوتا۔اس سے یہ بات تو ثابت ہوگئی کہ ایوان کے مسلمان ممبروں اور وزیروں کو اقتدار کی اتنی ہوس ہے کہ مسلمانوں پر چاہے قیامت بھی گزر جائے وہ ذرّہ برابر قربانی نہیں دے سکتے۔اس تبصرہ سے مراد کسی خاص افراد کو موردِ الزام ٹھہرانا نہیں ہے بلکہ اس کربناک حقیقت کو ظاہر کرنا ہے کہ

حمیت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے

یعنی مسلمانوں میں غیرتِ ملی باقی نہیں رہی۔ان کے نمایندے بڑھ چڑھ کر باتیں کریں گے، ان کے لیڈر تقریروں میں زمین آسمان کے قلابے ملائیں گے لیکن وہ امن کے زمانہ میں ملّت کی فلاح و اصلاح، تعلیم و تعمیر کی طرف دھیان نہیں دیں گے اور ہنگامہ اور مصیبت کے وقت ایثار اور قربانی سے دامن بچائیں گے۔سوچیے اگر بابری مسجد کی شہادت کے وقت ہمارے سارے نمائندے اور ہمارے وزرا استعفا دے دیتے تو کتنا زبردست، کیسا مؤثر یہ احتجاج ہوتا۔

جہاں تک امن کے زمانہ میں تعمیری کاموں میں دلچسپی لینے کا تعلق ہے، مرکزی حکومت کے ایک سابق سکریٹری نے جو وزارتِ فلاح کو دیکھتے تھے، راقم الحروف کو بتایا کہ درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کے ایم پی اپنے اجتماعی کاموں کے لیے دن رات ان کا محاصرہ کیا کرتے تھے لیکن مسلمان ایم پی راہ بھول کر بھی اُدھر نہیں آتے تھے۔ اجتماعی اور ملّی مسائل سے مسلمان رہبروں اور نمائندوں کا تغافل پسماندگی کے برگ و بار لاتا رہا ہے۔صرف رہبروں اور نمائندوں ہی کو الزام کیوں دیا جائے، عوام کا نقشا بھی یہی ہے۔ افراد اپنی کھال میں مست ہیں۔یہ بات ان کے

ذہن میں آتی ہی نہیں کہ جماعت کی تنظیم اور ترقی جبھی ہو سکتی ہے جب افراد اجتماعی مقاصد کے لیے ایثار کرنے کو تیار ہوں۔ ورنہ جماعت کا شیرازہ بکھر جائے گا اور بادِ مخالف کا ہر جھونکا اسے ریت کی دیوار یا بابری مسجد کی طرح چشم زدن میں گرا دے گا۔ خدارا افراد کو یہ احساس دلائے کہ اپنے ذاتی مفاد پر ملت کے مفاد کو بالا رکھنے میں ہی بقا، خوشحالی اور عزت اور ترقی مضمر ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں رہ گیا کہ بابری مسجد کے انہدام کی ذمہ داری سب سے زیادہ مرکزی حکومت، اس کے بعد سنگھ پریوار اور اس کے بعد مسلم قیادت پر ہے۔ مسلمان رہنماؤں نے ڈھٹئی کے ساتھ اپنی غلطی کا اقبال کرنے سے انکار کر دیا۔ انھیں تو عوامی زندگی سے فوراً کنارہ کش ہو جانا چاہیے تھا۔ چند روز تو انفعال کی رَو میں وہ سر چھپائے رہے۔ اس کے بعد سینہ تان کر پھر منچ پر آگئے تاکہ ان کو لوگ بھول نہ جائیں اور ان کی سیادت برقرار رہے۔ ستم یہ کہ بابری مسجد کے نام سے موسوم کمیٹی اپنی تخریب کاری میں بھی متحد نہ رہ سکی۔ اس میں پھوٹ پڑ گئی اور دو دو کمیٹیاں بن گئیں۔

بابری مسجد کی شہادت کے جلو میں جو فسادات ہوئے، جو غارت گری، حیا سوزی اور بربادی ہوئی وہ بابری مسجد کی شہادت سے زیادہ سنگین تھی لیکن ہمارے ملت آزار راہنما آگ کو ایندھن فراہم کرتے رہے۔ ایک صاحب بابری مسجد کی جگہ پر نماز پڑھنے کا اعلان کر کے آگے بڑھے، دوسرے صاحب نے ری پبلک ڈے کے بائیکاٹ کا اعلان کیا۔ اس طرح بربادی کی آنچ میں ایک تاؤ کا اضافہ ہو گیا۔ خارجی ذرائع ابلاغ نے اس خبر کو خوب اچھالا، حالانکہ وہ جانتے تھے کہ یہ اعلان صرف ایک تو آزن باختہ اور ہوش افگندہ شخص نے کیا تھا۔ ان محترم کو یہ بھی یاد نہیں رہا کہ شروعات بربادی کے اس افسانہ کی اسی قسم کے ایک اعلان سے ہوئی تھی۔ الغرض ان رہنماؤں کو جو ترقی اور تعمیر کی راہ میں رکاوٹ بن گئے ہیں راستہ سے ہٹ جانا چاہیے اور عام مسلمان کو اخلاص اور ایثار کا مطالبہ پہلے اپنے سے کرنا چاہیے، پھر اپنے رہنماؤں سے کہ وہ آئینہ دار عوام ہی کے تو ہیں۔

ان دہلا دینے والے سانحوں نے جا بجا مسلمانوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ رسمی اور غیر رسمی ڈھنگ سے وہ مل بیٹھتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ اپنے وطن میں اب ان کے لیے عزت اور آبرو کے ساتھ زندگی گزارنے کا ڈھنگ کیا ہوگا؛ بمبئی اور حیدرآباد کے مسلمانوں نے یہ محسوس کر کے کہ بغیر اتحاد کے وہ زندہ نہیں رہ سکتے اپنے اپنے ڈھنگ سے اتحاد کی طرف قدم اٹھایا ہے۔ اہل بمبئی نے اس بڑے اور ملت سوز فتنہ کا سدِّ باب کیا ہے جو مسالک کی جنگ کے نام سے مسلمانوں کو باہم دشمنی پر کمر بستہ کیے ہوئے تھا؛ حیدرآباد میں جہاں مسلمانوں کی دوسری

آبادیوں کی طرح بلکہ ان سے کچھ زیادہ، حسد، کدورت اور شماتت کا دور دورہ تھا
با اثر اشخاص نے مل کر پیمان کیا ہے کہ وہ رقابتوں اور عداوتوں کو یکقلم ترک کر دیں گے
اس طرح کے عہد و پیمان ہر جگہ ہونے چاہییں۔ یاد رکھیے کہ یہ پیش قدمی فرسودہ اور
از کار رفتہ قیادت نے نہیں کی، عوام نے کی ہے۔ ہر شہر میں اسی وضع کے عہد و پیمان درکار ہیں۔

یہ بات بار بار دہرائی گئی ہے کہ مسلمان دو دنیاؤں میں بٹے ہوئے ہیں:
دینی دنیا اور دنیاوی دنیا۔ ان کی قیادت کا بھی یہی حال رہا ہے۔ یعنی ایک طرف
عالمانِ دین ہیں دوسری طرف عصری تعلیم یافتہ افراد جنھوں نے زندگی کے مختلف
شعبوں میں اعتبار حاصل کیا ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے دور دور رہتے
ہیں۔ اب زمانہ اجتماعی قیادت کا آگیا ہے۔ دونوں کو مل کر بیٹھنا چاہیے۔ ایک کی
دینی بصیرت اور دوسرے کی عصری آگہی اور سیاسی سوجھ بوجھ مل کر چلیں تو کوئی
بات بنے، ورنہ نہ یہ مؤثر ہو پائے گی نہ وہ۔

مسلمانوں کی اجتماعی قیادت، جیسی بھی اب وہ ابھرتی ہے، الگ رہ کر کچھ نہیں کر پائے گی
اسے اہل وطن کے ان طبقوں کے ساتھ تعلقات استوار کرنے چاہییں جو یا تو مسلمانوں
کے ساتھ ہمدردی رکھتے ہیں یا جن کے مصالح اور مفادات مسلمانوں کے مصالح اور مفادات
کے ساتھ میل کھاتے ہیں۔ یہ مسئلہ دراصل پُرپیچ ہے اور اس کے مضمرات ابھی پردۂ
راز میں ہیں۔ ماضی کا ورثہ بھی مستقبل کے امکانات کی راہ کاٹ رہا ہے۔ ظالموں کا ہمیشہ
سے یہ دستور رہا ہے کہ مظلوموں کو یکجا نہ ہونے دیا جائے، انھیں باہم ٹکرا دیا جائے
غالب مغلوبوں، طاقتور کمزوروں اور زیرک سادہ لوحوں کے ساتھ ہمیشہ اسی قسم کا برتاؤ
کرتا ہے۔ مسلمانوں کی نمائندگی آگے چل کر جن لوگوں کے ہاتھ میں آئے گی، اُن میں
جو اجتماعی قیادت ابھرے گی اسے دیرینہ سیاسی وابستگیوں کو ترک کر کے نئے
معاہدے کرنے ہوں گے۔ انھیں تازہ دمی اور دور اندیشی کا ثبوت دینا ہوگا لیکن
بات ان کی جبھی بن جائے گی جب اُن میں اتحاد ہوگا اور طاقت ہوگی۔ طاقت حاصل
کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ علم ہے۔ عوام پڑھ لکھ جائیں تو ان کی قیادت خود ہی سنور جائے۔

الغرض زخم خوردہ ہندستانی مسلمانوں کو اب ایک لمحہ بھی کفِ افسوس ملنے
پر ضائع نہ کرنا چاہیے۔ وہ پہلے سے ہی پچھڑے ہوئے ہیں۔ انھیں سروسامان
کرنا چاہیے اپنے تحفظ اور تعمیر کا۔ اور یہ تعمیر داخلی اتحاد اور خارجی معاہدوں
(یعنی اپنے ہمدرد اور ہم مفاد اہل وطن کے ساتھ مفاہمت) اور تعلیمی
پیش قدمی کے ذریعہ ہی ممکن ہو پائے گی۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے
لوگ ہمیں مٹانے پر تلے ہوئے ہیں۔ خطرہ سے نبرد آزما ہونے کے لیے پوری
یکسوئی اور لگن کے ساتھ تیاری درکار ہوگی۔

(۴ مارچ ۱۹۹۳ء)

آزمایش کی گھڑی

جتنی فکر مسلمان اپنے مستقبل کی اس وقت کر رہے ہیں اتنی فکر انھوں نے پہلے کبھی نہیں کی۔ اس فکر میں ملک کے روشن خیال عناصر مسلمانوں کے شریک ہیں لیکن ابھی تک کوئی شکل ایسی نہیں نکلی جو ہندستان میں مسلمانوں کی سلامتی اور خوش حالی کی طرف اشارہ کرتی ہو۔ یہ بھی یقین نہیں کہ جو لوگ اس وقت ساتھ دے رہے ہیں وہ آگے چل کر سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے پلٹ نہ جائیں۔ اس وقت انصاف پسند جماعتیں اور افراد مسلمانوں سے ہمدردی اس لیے کر رہے ہیں کہ ان پر مظالم کا پہاڑ توڑا گیا ہے جس نے ہندستان کی تصویر کو بگاڑ دیا ہے۔ جب ہمدردی اور رحم کی باڑھ اُتر جائے گی تو پھر ان کا گوشۂ خاطر شاید مسلمانوں کی طرف نہ رہے یا اس حد تک نہ رہے۔ کانگریس کے دور میں مسلمانوں کے ساتھ (پالیسی کا اعلان کچھ بھی ہوتا رہا ہو) لگاتار ناانصافیاں اور زیادتیاں ہوتی رہیں اور وہ زوال کی منزلیں طے کرتے رہے۔ کانگریس ان کی مائی باپ بن گئی تھی لہذا وہ شور نہ مچا سکے اور تغافل اور ظلم کے خلاف کوئی مؤثر احتجاج بھی نہ کر سکے۔ ان کے بیشتر نمایندے اپنی ذاتی اغراض کا تعاقب کرتے رہے۔ مسلمانوں پر اُلٹا الزام یہ آیا د جیسے سنگھی سنگٹھن ہر آن دُہرا رہا ہے، کہ مسلمانوں کا کانگریسی سرکار لاڈ کرتی چلی آئی ہے جس کی وجہ سے اکثریت کی حق تلفی ہو رہی ہے۔ سنگھ کے سارے سنگٹھنوں کو بڑی مہارت حاصل ہے لفظوں کے معنی بدلنے اور حقیقت کو سر کے بل کھڑا کر دینے میں۔ بابری مسجد کے سلسلہ میں اس کی پیمان شکنیاں اور دروغ گوئیاں اور تاویلیں بظاہر کبھی نہ ٹوٹنے والا ریکارڈ بن گئی ہیں۔ اب مسلمان کس گروہ پر بھروسا کریں۔ بھاجپا درپئے آزار اور ناقابلِ اعتبار، کانگریس کا ریکارڈ سیکولرزم کے دعووں کے باوجود ایک سرے پر تعصّب، دوسرے سرے پر غفلت سے داغ دار، جنتا دل دونیم اور ڈھلمل یقین۔ رہ گئیں، بائیں بازو کی ترقی پسند جماعتیں، سیکولرزم ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے لیکن یہ پارٹیاں پسپائی کی

منزلیں طے کر رہی ہیں، بڑی حد تک شہر نشیں ہوگئی ہیں۔ مسلمانوں، مظلوم مسلمانوں کے، حق میں یہ آواز بلند کرتی ہیں تو کچھ ڈھارس بندھ جاتی ہے لیکن ان ساری پارٹیوں میں کسی کی حیثیت ستون کی نہیں ہے کہ ان سے ٹیک لگائی جاسکے۔ ناموافق محاذ کو موافق کس طرح بنایا جائے، یہ ہماری سیاسی بصیرت کی آزمایش ہے۔

مسلمانوں کی آبادی ہندستان کی آبادی کا ساتواں حصّہ بھی نہیں۔ تعداد کو دیکھیے تو وہ اکثریت سے ٹکر نہیں لے سکتے۔ تعلیمی، اقتصادی اور سماجی حالت کو دیکھیے تو وہ بہت پچھڑے ہوئے۔ فسادوں کے دوران پولیس اکثر مظلوم مسلمانوں کے خلاف اور ظالموں کے موافق صف آرا ہو جاتی ہے۔ ان کی سلامتی اور عافیت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ پھر کس طرح وہ جان مال آبرو کی حفاظت کریں۔ حکومت بار بار حفاظت کا اعلان کرتی ہے اور تدبیریں بھی، کبھی سنجیدگی، کبھی نیم دلی کے ساتھ۔ لیکن فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ زیادہ سنگین اور طویل ہوتا جاتا ہے۔ عداوت اور شقاوت بڑھ رہی ہے وہ دور بھی گزر گیا جب مسجد کے سامنے باجا بلوے کی شکل اختیار کر لیتا تھا، اکثریت کا مذہبی تعصّب ایودھیا، سورت اور بمبئی کے ساتھ اپنے عروج اور اَدھکتم وسعت کو پہنچ گیا ہے۔ فساد اب منصوبہ بند طریقے سے کرائے جارہے ہیں۔ لوگوں کے کانوں میں زہر بھر دیا گیا ہے۔ ذہن مسموم ہوگئے ہیں، وبا نے سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ ظلم نے پشیمانی سے ناطہ توڑ کر فخر کے ساتھ جوڑ لیا ہے۔ جو لوگ ڈنکے کی چوٹ پر مسلمانوں کے خلاف آگ لگا دینے والے بھاشن دیتے پھرتے ہیں، ان کی چیرہ زبانیوں کو قانون سہمے ہوئے دیکھتا رہتا ہے، سنتا رہتا ہے اور دم سادھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اب وہ لوگ جن پر ظلم ہو رہا ہے، فریاد کریں تو کس سے؟ سرکار پر سے اعتماد اٹھ جائے تو انجام بھیانک ہو سکتا ہے۔ ظالموں کی بڑھی ہوئی شقاوت، اور منصوبے کی کوکھ سے جنمے ہوئے سلسلہ بند فسادات اور پولیس کی ظلم نوازی چشم پوشی یا ناکارہ پن۔ ان سب کا مقابلہ ایک ایسی ملّت کو کرنا ہے جس میں تنظیم نام کی کوئی شے ہے ہی نہیں۔ اور جسے حسد، بے عملی، بے ایثاری اور نااتفاقی نے اپنے بے درد شکنجہ میں کس لیا ہے۔ کتنی بڑی آزمایش ہے، یہ ہم پر کتنا بُرا وقت پڑا ہے؟

افرادی طاقت کے اجزائے ترکیبی تین ہوتے ہیں: تعلیم، صحت، یقین تعلیم سے مدّت ہوئی ہم نے منہ پھیر لیا، کوئی اجنبی بھی جو ہمیں دیکھے گا پہلی نظر میں سمجھ لے گا کہ نہ ہمارے اوقات و اطوار، نہ ہماری غذا، نہ ہمارا طرز زندگی، نہ ہمارا ماحول ہمیں تندرست رکھ سکتا ہے۔ بہت ہمت کر کے ہم میں سے کچھ لوگ گھنی اور گندی بستیوں سے نکلتے ہیں تو بلووں کے دوران اغیار کی نگہ التفات

کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ یقین کا جہاں تک تعلق ہے اس نے بہت دنوں سے ہمارا ساتھ چھوڑ رکھا ہے۔ یقین، اللہ کی نصرت، اپنے مسلک اور مقصد، اور اپنی اجتماعی صلاحیت اور روشن مستقبل پر، ہم میں سے زیادہ تر نے ظواہرِ مذہب کو حدِّ نظر بنا لیا ہے۔ اس کی دل کو گرما دینے والی روح سے ہمارا کوئی سروکار نہیں رہا۔ ہمارے اندر اس یقین، اعتماد اور افتخار کی کمی ہے جو اقوام کو سرگرمِ عمل کرتے ہیں اور جن کے بازوؤں پر معرکے سر کیے جاتے ہیں۔

تعلیم کی طرف واپس آیئے تو اس تغافل سے بھی زیادہ تشویش ناک جو ہم نے اس کے تئیں روا رکھا ہے وہ وضع اور سطح ہے جس پر ہمیں تعلیم دی جاتی ہے۔ ہمارے اپنے انگریزی اسکول خانہ جنگی کو تعلیم کا اصلِ اصول سمجھتے ہیں، معیار کو دردِ سر سمجھ کر انھوں نے طاق پر بٹھا دیا ہے اور تعداد پر قناعت کر کے بیٹھ گئے ہیں۔ کیف کی کمی کم سے پوری کی جاتی ہے۔ ریاستی سرکاریں، خصوصاً اُتری بھارت میں، ہمارے اسکولوں کو تسلیم کرنے میں تاخیر کو ڈھال بنا لیتی ہیں، سرکاری اسکول کھولتے وقت ہماری آبادیوں کی طرف سے نظر ہٹا لیتی ہیں۔ جو لوگ تعلیم کے لیے تنظیم اور ترتیب کے ساتھ کام کرنا چاہیں انھیں سرکار یہ بتا کر ہی نہیں دیتی کہ مسلمانوں کی تعلیمی کیفیت کہاں کہاں کیا ہے۔ رجسٹرار جنرل کو شاید ہدایت کی گئی ہے کہ خبردار، مردم شماری کے دوران مسلمانوں کی تعلیمی حیثیت کے بارے میں جو آنکڑے جمع کیے گئے ہیں اس کی آہٹ بھی انھیں نہ ملنے دو۔ پردہ مسلمانوں کی تعلیمی کیفیت پر ڈالنا تھا اس لیے تعلیم کے فرقہ وار اعداد و شمار داخلِ دفتر کر دیے گئے۔ خبر ہی نہیں ہوگی تو شکایت کیسے کریں گے۔ آنکھیں بند رہیں گی تو مُنہ بھی نہ کھُل پائے گا۔

دینی تعلیم کا حال ابتر ہے۔ یہ تو داد دیجیے ان لوگوں کو جو ذرائع کی حوصلہ رُبا کمی کے باوصف مکتبوں اور مدرسوں کو کسی طرح چلا رہے ہیں۔ ان کا نصاب دیکھیے تو احساس ہوگا کہ دنیا سے بے خبر رکھنے کا اہتمام کیا گیا ہے اور دین کی تعلیم اس انداز سے دی جاتی ہے کہ دین کی روح ہاتھ نہیں آتی۔ ان مدارس کے فارغین، جو دنیا کے حالات اور دوسرے مذاہب سے نا آشنا ہیں، دعوت کا کام کیسے انجام دیں گے۔ اور روزمرّہ کی زندگی میں دوسروں کے لیے مثال کیسے بنیں گے۔ پڑھانے کے طریقہ میں بھی مدّتِ دراز سے کسی تبدیلی کی جسارت نہیں کی گئی۔ علم دراصل ناقابلِ تقسیم ہے۔ طریقِ تدریس نے عالمگیر تجربات کے سایہ میں جو ترقیاں کی ہیں ان کو نظر انداز کرنے کے بعد ہم علم کو پہنچانے کا حق ادا کر سکتے ہیں؟

علوم کے دائرہ میں گزشتہ پچھتّر برسوں میں ایسا زبردست انقلاب آیا ہے جسے وسپھوٹ یا ایکس پلوژن کہا جاتا ہے جو کوئی اس وسپھوٹ سے ہم رفتار نہ

ہوسکے گا وہ اس کی زد میں آ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔

مسلمان جو تعلیم میں اس قدر پیادہ رو ہیں اگر اب بھی اپنی پسماندگی کا کفارہ کمر کس کے ادا نہیں کرتے تو کارواں کے پاؤں تلے روندے جائیں گے۔ اتنی بڑی قیامت جو ان پر حال ہی میں گزری ہے اس کے دو مثبت جواب تھے: تعلیم اور تنظیم، دونوں میں سے کسی میں حرکت کے آثار نہیں دکھائی دیتے۔ پھر اس بڑی آزمائش میں وہ کیوں کر پورے اتریں گے؟

مسلمانوں کی اعلا تعلیم کا اندازہ لگانا ہو تو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی اور جامعہ ملّیہ اسلامیہ کے احاطوں میں گھوم کر دیکھیے۔ کچھ مستثنیات کو چھوڑ کر، خواہ اساتذہ ہوں، خواہ طالب علم، صرف کیمپس کی بابت بات کرتے نظر آئیں گے بہتوں کی باتیں بھی اکثر غیبت، حسد یا استہزا کے انداز میں۔ ملک میں یا دنیا میں یا علوم کی دنیا میں۔ کیا ہو رہا ہے، ان کی بلا جانے۔ ہمارے طالب علموں کا، اچھے طالب علموں کا انداز، ان کی فکر کی اٹھان، یہ ہوتی ہے کہ جو ادارہ تعلیم دے رہا ہے، نوکری بھی وہی دے گا۔ علی گڑھ پر یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن کی ریویو کمیٹی نے داخلی نسل کشی (ان بریڈنگ) کی تہمت رکھی تھی جس کا جواب آج تک کسی سے بن نہیں پڑا۔ عام طالب علموں کے (طالب علموں کے کیوں کہیے، طالب علم رہنماؤں کے) یہ لچھن ہیں کہ انھیں ہنگامہ برپا کرنے اور تعلیمی سال کو برباد کرنے کے لیے بہانہ چاہیے۔ جامعہ ملّیہ اسلامیہ میں طالب علموں نے بغیر کسی جواز کے، غلط باتیں پھیلا کر اور غلط نتائج نکال کر اپنے پرو وائس چانسلر کے خلاف الزام و دشنام اور تشدد کی ایک مہم چلا دی۔ چار مہینے کے قریب برباد ہو گئے، دنیا کی نگاہوں میں جامعہ ملّیہ اور اسلام کی تصویر بگڑی۔ اس کے بعد انتہائی غیر اسلامی شعار اختیار کرتے ہوئے اپنے استاد (پرو وائس چانسلر) کو زد و کوب کیا۔ اب وہ اپنے گھر سے پرو وائس چانسلری کر رہے ہیں، جامعہ آنے میں انھیں اپنی جان کا خطرہ ہے۔ حساب لگائیے نقصان کتنا اور کس کا ہوا۔

ہماری ان یونی ورسٹیوں کا ایک بڑا المیہ یہ بھی ہے کہ وہاں ہنگامہ انگیزی کو ہمارے باتدبیر وزیروں کی طرف سے شہ ملتی رہی ہے، کہ ان کی دکان اسی طرح چلتی ہے۔ جہاں برسر اقتدار پارٹی ساتھ نہیں دیتی وہاں دوسری پارٹیاں اکھاڑے میں کود پڑتی ہیں۔ نقصان صرف طالب علموں کا ہوتا ہے۔ لیکن اس سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہمارے علما اور دوسرے غیر سیاسی اکابرین بھی ایسے تخریب کار طالب علموں اور ان کی جامعہ دشمن تحریکوں کی مذمت نہیں کرتے۔ وجہ دو میں سے ایک ہو سکتی ہے۔ اطلاع کی کمی یا جرأت

کی کمی۔ دونوں میں سے کوئی قابلِ معافی نہیں۔ ہمارے ملّی ضمیر کو ان امور پر بھی بیدار ہونا چاہیے جن کا تعلق ذہن کی تربیت، شخصیت کی تشکیل اور دنیا میں کامیابی سے ہے۔

قوموں اور جماعتوں اور ملّتوں کو بنانے میں صحت اور رحم جوئی کا بڑا حصّہ ہوتا ہے۔ اس طرف بھی اب ایک عرصے سے ہماری نظر صرف اُچٹتی ہوئی پڑتی ہے۔ صحت مند ذہن کا ٹھکانا صحت مند شخصیت میں ہوتا ہے۔

الغرض بڑی شدید ضرورت ہے ہمیں اپنے نقطۂ نظر، اطوار و عادات، مشاغل اور ردِّ عمل کو بدلنے کی۔ بڑی بڑی مصیبتیں سوتی ہوئی صلاحیتوں کو مہمیز کرتی ہیں۔ جو مصیبت ہم پر دسمبر ۹۲ء اور جنوری ۹۳ء میں پڑی وہ ماضی میں اپنی تیاریوں اور مستقبل میں اپنے امکانات کے لحاظ سے اتنی سنگین ہے کہ اس سے زیادہ بھیانک مصیبت تصوّر میں نہیں آتی۔ اس نے ہمارے اطمینان و سکون کو برہم تو کر دیا، ہم سوچنے پر مجبور ہو گئے لیکن ہماری فکرمندی نے عمل کی شکل ابھی تک اختیار نہیں کی۔ آزمائش کی اس گھڑی نے ہمیں جہد ساماں نہیں پایا۔ مصیبت جو آزمائش اپنے ساتھ لائی ہے، ان میں پورا اُترنے کی کوئی قابلِ لحاظ کوشش ہنوز نظر میں نہیں آئی۔

اتنے حشر خیز سانحے کے بعد ہم سے یہ بھی نہ ہوا کہ مل بیٹھتے اس طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے جس نے ہمارا گھر دیکھ لیا ہے اپنی بہترین صلاحیتوں اور اپنی اعلا ترین افرادی طاقت کو بروئے کار لے آتے۔ یہ سوچنا بھی مناسب نہ ہوگا کہ پرسنل لا بورڈ اور ملّی کونسل کے اراکین، ہر چند محترم ہونے کے باوجود، اس طوفان کو پیچھے دھکیل سکیں گے جو منہ کھولے ہوئے ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے اندر کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو ہندستان بھر کے مسلمانوں کی رہنمائی کر سکے۔ اور اگر اتفاق سے کوئی ایسا شخص پیدا بھی ہو جائے تو اس وقت جو مزاج ہمارا ہے ہم اس کی قیادت کو ہرگز تسلیم نہیں کریں گے۔ لہٰذا ضرورت اجتماعی، پُر اخلاص، دور اندیش اور ہمہ گیر قیادت کی ہے۔ ہمارے یہاں علمائے کرام کے علاوہ جس کی عالمی اور عصری بصیرت بالعموم بہت محدود ہے، عصری علوم کے ماہرین ہیں، یونی ورسیٹیوں کے بعض ممتاز اور درد مند پروفیسر ہیں۔ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی ذہانت، عملی سوجھ بوجھ اور طرزِ ارتباط کے سہارے، تجارت، صنعت، ملازمت، ڈاکٹری، وکالت، زراعت اور دوسرے پیشوں میں امتیاز حاصل کیا ہے اور وہ لوگ بھی ہیں جنھوں نے ملک کے بعض علاقوں میں تعلیم اور فلاح کے قابلِ قدر کام انجام دیے ہیں۔ ملّی قیادت میں، اجتماعی ملّی قیادت میں، ان سب کی نمایندگی ہونی چاہیے۔ ان سب کو ایک

ساتھ بیٹھ کر سارے امور پر پوست کندہ غور و خوض کرنا چاہیے۔ ڈر ہے کہ یہ موقع اگر ہاتھ سے جانے دیا گیا تو پھر شاید موقع ہی نہ ملے۔ مسئلہ یہ ہے کہ مسلمان ملک اور بالخصوص اکثریت کے تعلق سے اپنے نقطۂ نظر اور تعلقات کو از سرِ نو کس نہج پر ڈھالیں گے۔ یہ وقت چھوٹی موٹی تدبیروں اور ٹھوک پیٹ کا نہیں ہے۔ یہ وقت انتہائی اہم، انقلاب آور، دُور رس اور ملت ساز اور عہد آفریں فیصلے کرنے کا ہے۔ ان فیصلوں کو باخبری، سوجھ بوجھ اور جرأت درکار ہوگی۔ پرسنل لا بورڈ نے بہت کام کیا ہے اور اس نے فی الجملہ اعتدال اور توازن کا رخ اختیار کر رکھا ہے لیکن یہ بات بہر حال کچھ انوکھی سی لگتی ہے کہ ملّت کی ہمہ گیر قیادت اس بورڈ کی تحویل میں ہو جو پرسنل لا کے تحفظ کے لیے وجود میں لایا گیا تھا۔ یہ وقت مسلمانوں کی آزمایش کا ہے کیا وہ اپنی تمام ذہنی اور اخلاقی صلاحیتوں اور اپنی افرادی طاقت کو بروئے کار لا سکتے ہیں یا نہیں۔

اور بروئے کار لانے کا مفہوم صرف رہنما خطوط فراہم کر دینا نہیں ہے بلکہ اپنی مثال اور ایک بے مثال جد و جہد سے مسلمانوں کو تعمیر، تنظیم، تعلیم، فلاح اور اصلاح کے لیے سرگرم عمل کر دینا بھی ہے۔ ہم میں سے چند اہل فکر، مسلمانوں کو مشورہ دے رہے ہیں کہ ہتھیار ڈال دو، اکثریت کی انتہا پسندی اور اس کی برہنہ جارحیت کے آگے کندھے ڈال دو۔ انھیں دوسروں کا یہ مشورہ بھی گراں گزرتا ہے کہ ملت خود کو مضبوط کرے۔ ایک حد تک اپنے تحفظ کا انتظام بھی کرے۔ طاقت کی منطق کا انھیں احساس ہی نہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ ضعیفی سے بڑا اس عالم اسباب میں کوئی جرم ہی نہیں۔ زندگی میں حوصلہ، اعتماد اور زندہ دلی کی محوری اہمیت ان حضرات کی نگاہ سے اوجھل ہے۔ انھیں معلوم ہی نہیں کہ

غارتگرِ گلزار ہیں جو پھونک رہے ہیں
کانوں میں گل و لالہ کے مرجھانے کی باتیں

شاعر نے کہا ہے ؎ چمن میں آہ کیا جینا جو ہو بے آبرو جینا

ہم اس طرزِ استنباط اور طریق استدلال کو دور سے سلام کرتے ہیں جو حوصلہ سرافرازی، عزّتِ نفس اور آرزومندی اور عزائم پر ضرب لگاتا ہو۔ سوال جوش دلانے کا نہیں ہے۔ جوش اور ہوش دو ہم وزن لفظ ہیں۔ انسانوں اور جماعتوں کو ضرورت دونوں کی پڑتی ہے۔ فرق صرف ترتیب کا ہے۔ اگر جوش کو پہلے رکھا تو جب ہوش آئے گا وہ پشیمانی اور بے بسی کو ساتھ لے کر آئے گا۔ اگر ہوش کو پہلے رکھا تو جوش اس کا تابعِ فرمان ہوگا، اس کا کہنا مانے گا، اس کے کہے پر چلے گا اور اس کے منصوبوں اور ارادوں کو اجتماعی طاقت کے ذریعہ پایۂ تکمیل تک پہنچائے گا۔ جوش نہ ہو تو ہوش نہتا اور بے عمل رہ جاتا ہے۔ ہوش نہ ہو

تو جوش کو راہ دکھانے والا کوئی نہیں ہوتا وہ بے سمت اور بے عنان ہو جاتا ہے۔ ضرورت ایسی سیادت کی ہے جو ہوش کی راہ پر جوش کو چلا سکے۔ جو فکر کو اجتماعی عمل کا روپ دے سکے۔ فی الحال تو دینی اور عصری مفکرین اور مخلصین مل کر ہی یہ کام کر سکتے ہیں۔ اگر ایک نے دوسرے کو، اور دونوں نے اس خطرناک گھڑی کی اہمیت کو نظر انداز کیا تو کام بن چکا۔

پایانِ گفتگو میں ایک بات اور دُہرا دی جائے مسلمان اگر اقلیتوں، پسماندوں اور کمزوروں سے ناطہ توڑ لیں تو اقلیت اکثریت اور اکثریت اقلیت میں بدل جائے، یہ بات سامنے کی دیوار پر لکھی ہوئی ہے، اسے پڑھنے کے لیے چشم بینا چاہیے۔ آزمائش کی گھڑی پکار پکار کر کہہ رہی ہے

ع کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگنِ عشق

۱۱ مارچ ۹۳ء

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

اسرارِ خودی (فراموش شدہ اڈیشن)	(شعری مجموعہ)	مرتبہ: شائستہ خان	۷۵/
تموربی اور بابلی تہذیب و تمدن	(تاریخ)	مالک رام	۷۵/
جام جہاں نما۔ اردو صحافت کی ابتدا	(اردو صحافت)	گربچن چندن	۷۵/
مسلمانوں کا تعلیمی نظام	(تاریخی)	ضیاء الحسن فاروقی	۴۵/
اردو ناول میں عورت کا تصور	(تحقیق)	فہمیدہ کبیر	۴۵/
نوٹوں کی تلاش	(ناول)	ایاز سیوہاروی	۶۰/
تاثر نہ کہ تنقید	(تنقید)	صدیق الرحمٰن قدوائی	۵۱/
اپنے دل کی حفاظت کیجیے	(ایلوپیتھی)	ترجمہ نذیر الدین مینائی	۲۵/
بہ صورت گر کچھ خوابوں کے	(انٹرویوز)	طاہر مسعود	۶۶/
مرضیات	(طب)	حکیم نعیم الدین زبیری	۵۱/
بانگ درا	(شعری مجموعہ، طلبہ ایڈیشن)	اقبال	۹/
بالِ جبریل	(شعری مجموعہ)	〃	۶/
ضربِ کلیم مع ارمغانِ حجاز (اردو نظمیں)	(شعری مجموعہ)	〃	۶/
ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی	(ناول)	کشمیری لال ذاکر	۴۸/
گوشے میں قفس کے	(طنزیہ مزاحیہ)	دلیپ سنگھ	۴۵/
سحر کے پہلے اور بعد	(جگ بیتی)	سعید الظفر چغتائی	۵۱/
افکارِ اقبال	(اقبالیات)	محمد عبد السلام خاں	۱۲۵/
فرمان فتح پوری	(شخصیت اور ادبی خدمات)	مرتبہ خلیق انجم	۲۵
تذکرہ ماہ و سال	(تذکرہ)	مالک رام	۱۲۵/
تحقیق نامہ	(تحقیق)	مشفق خواجہ	۱۲۵/
شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان	(مذہب)	حکیم محمود احمد برکاتی	۴۵/
خواب اور خلش	(شعری مجموعہ)	آل احمد سرور	۶۶/
سفر	(ناول)	رابعہ تبسم	۲۷/
تحریریں	(تنقید)	ڈاکٹر اسلم پرویز	۵۱/
پہچان اور پرکھ	(تنقید)	پروفیسر آل احمد سرور	۵۱/
ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم	(تحقیق)	ڈاکٹر سلامت اللہ	۵۱/
پت جھڑ کی آواز (نیا اڈیشن)	(افسانے)	قرۃ العین حیدر	۷۵/
اقبال کا نظریہ خودی	(تحقیق)	عبد المغنی	۱۵۰/
سمندری خزانہ	(ناول)	ماریہ رحمان	۲۷/
جدید افسانہ اور اس کے مسائل	(تنقید)	وارث علوی	۳۶/
فی الحقیقت	(طنز و مزاح)	یوسف ناظم	۴۵/
مٹی سے ہیرا	(ناولٹ)	سید مقبول احمد	۱۰/
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو	(ناولٹ)	صغرا مہدی	۲۴/
الجھاوے	(ڈرامے)	ابراہیم یوسف	۵۱/
مباز منزل	(شعری مجموعہ)	غلام ربانی تاباں	۲۵/